

327/Rop

سلسلہ پھولوں کا



باطِ گل ہو یا دامنِ صحرَا
جنوں کا قافلہ چلتا رہے گا

مکملح الدین نیتر

جملہ حقوق بہ حق مصنف محفوظ ہیں

تاریخ و سن اشاعت :	یکم جنوری ۱۹۹۲ء
تعداد اشاعت پہلی بار :	ایک ہزار
کتابت :	مسعود انور
طباعت :	اعجاز پرنٹنگ پریس - چھتہ بازار، حیدرآباد
طباعت سرورق :	انتخاب پریس، جواہر لال نہرو روڈ - حیدرآباد
ناشر :	صلاح الدین نیئر
ترتیب و تزئین :	ڈاکٹر صابرہ سعید (رخسانہ)
	انیس قیوم فیاض

• جزوی رقمی اعانت : اُردو اکیڈمی، آندھرا پردیش
 • قیمت : عام خریداری کے لئے :- ۳۰ روپے
 • بک سیلرز اور لائبریریوں کے لئے :- ۵۰ روپے

- ملنے کے بعد -

۵ حسامی بک ڈپو - چھسلی کمان - حیدرآباد - ۲۰۰۰۰۰۰۰
 ۵ مصنف - 'بہکشا' ۸۲۴/۷ - ۳ - ۱۱، 'طے پٹی' حیدرآباد - ۱۰۰۰۰۰۰۰
 قون نمبر ۲۲۸۸۰۲



صلاح الدين زير

انتساب

محترم المقام

جناب عابد علی خاں

— اور —

جناب محبوب حسین جگر

— مجھ نام —

جن کی بے پایاں شققت، مخلصانہ تربیت

اور دیرینہ سرپرستی میں میرا ذہنی سفر جاری ہے

خوشبو کے سفر کی طرح

صلاح الدین میسر

ترتیب و تزئین

صفحہ نمبر

۱۰

سرنیزشتِ دل — (مصنف)

سرچشمہ فیضان (اسلاف کی خوشبو)

- ۱۹ گھر آنکھن
- ۴۴ پہلی اور آخری بار بدوق اٹھانا
- ۴۶ پرندوں کا شکار
- ۴۶ ندیوں اور باولیوں میں تیرنا
- ۴۷ بھس بدلنا
- ۴۸ پتھروں کی بارش
- ۴۹ جے۔ رام جی کی مٹھانی
- ۵۰ جے۔ اباد کا محرم
- ۵۲ درگاہیں، زیارتیں اور نیازیں
- ۵۳ ہمناباد کی جاترائیں
- ۵۴ پولیس ایکشن
- ۵۹ علی گڑھ میٹرک کا امتحان
- ۶۱ اُجالوں کا سفر

کارزار حیات (ملازمت، اعلیٰ عہدیداروں سے مراسم، ادبی و فلاحی مصروفیات)

- ۶۹ ڈائریکٹریٹ اور سکریٹریٹ کی ملازمت
- ۷۹ ایس۔ اے۔ قادر۔ ایڈیشنل چیف سکریٹری
- ۸۰ بھارت چمنہ کھنہ، آئی۔ اے۔ ایس
- ۸۲ سید ہاشم علی اختر، آئی۔ اے۔ ایس
- ۸۳ غلام احمد، جوائنٹ سکریٹری
- ۸۴ ایس۔ اے۔ واسح، جوائنٹ سکریٹری
- ۸۶ محمد تاج الدین، آئی۔ اے۔ ایس
- ۸۷ بی۔ این۔ واگھرے، آئی۔ اے۔ ایس
- ۸۹ ایس۔ اے۔ عزیز، ایڈیشنل سکریٹری
- ۹۰ صادق احمد، جوائنٹ سکریٹری
- ۹۱ سید تراب الحسن، آئی۔ اے۔ ایس
- ۹۳ رمن راؤ، آئی۔ اے۔ ایس
- ۹۴ خواجہ حمید الحمید، اسسٹنٹ سکریٹری
- ۹۶ عبد الحمود، اسسٹنٹ سکریٹری
- ۹۷ مبشر احمد، جوائنٹ سکریٹری
- ۹۹ رشید قریشی، جوائنٹ سکریٹری
- ۱۰۰ سعد حسین سعد، آئی۔ اے۔ ایس
- ۱۰۲ غلام دستگیر قریشی، آئی۔ اے۔ ایس

- ۱۰۴ نریندر کوٹھار، آئی۔ اے۔ ایس
- ۱۰۶ ڈاکٹر حسن الدین احمد، آئی۔ اے۔ ایس
- ۱۰۸ خالد انصاری، آئی۔ اے۔ ایس
- ۱۱۰ اے۔ کے۔ گوئل، آئی۔ اے۔ ایس
- ۱۱۱ وینکٹ رمن چاری، آئی۔ اے۔ ایس
- ۱۱۲ ڈاکٹر سی۔ نارائن ریڈی سترے، صدر نشین لینگویج کمیشن
- ۱۱۴ آر۔ ترسمہاراؤ اور وینکٹ رامیا، اکاؤنٹس آفیسر
- ۱۲۱ سکریٹریٹ کے عہدہ داروں سے مراسم
- ۱۲۲ سکریٹریٹ کے میرے ساتھی
- ۱۲۲ سکریٹریٹ کے تین اور اہم نام
- ۱۲۵ شاعروں اور ادیبوں کے مسودات
- ۱۲۶ جناب ٹی۔ انجیا، چیف منسٹر اور ملک الشعراء اور جلیقوی
- ۱۲۸ کالج آف اورینٹل لینگویجس کی گرانٹ
- ۱۲۹ المہینہ کالج آف ایجوکیشن محبوب نگر
- ۱۳۰ ہندی اکیڈمی

علمی، ادبی و تہذیبی سرگرمیاں

- ۱۳۲ ادارہ ادبیات اردو
- ۱۳۴ اردو اورینٹل کالج

- ۱۳۶ اردو فیسٹول
- ۱۳۸ یوم محمدؐ قلی قطب شاہ اور مقابلہ بیت بازی
- ۱۴۰ اردو مجلس
- ۱۴۲ ہوز نامہ سیاست
- ۱۴۴ نظام گزٹ
- ۱۴۵ ماہنامہ خاتونِ دکن
- ۱۴۸ بزمِ سعدی
- ۱۴۹ ادارہ اتحاد الشعراء
- ۱۵۰ بزمِ جیون
- ۱۵۱ ادبی ٹرسٹ
- ۱۵۳ ادارہ شعر و حکمت
- ۱۵۴ زندہ دلائل حیدر آباد
- ۱۵۵ سکرٹریٹ اردو اسوسی ایشن
- ۱۶۰ مخفیلِ خواتین
- ۱۶۳ شکر جی میموریل سوسائٹی (کلید شاعری)
- ۱۶۳ انجمن ترقی پسند مصنفین
- ۱۶۶ دیارِ ادب
- ۱۶۷ جمشٹ گولکنڈہ سوسائٹی
- ۱۷۰ مشاعرہ دکن

- ۱۷۲ اولداسی یوہن فسیٹول
۱۷۴ میرا شہر میرے لوگ

○ خوشبو کا سفر

- ۱۷۶ شعری مجموعے
۱۷۷ شعری کتابیں اور شعری مجموعے (ترتیب و ترتیب)
۱۷۸ شعری مجموعوں پر انعامات
۱۷۹ شعری، ادبی و تہذیبی خدمات کے اعتراف میں اعزازات
۱۸۰ ملک اورد بیرون ملک کے مشاعرے اور دیگر تفصیلات
۱۹۰ تحقیق شعری محرمات - ایک مثال
۱۹۱ آٹو گراف اور شاعر
۱۹۳ شعری سوانح نگار کا مشاعرہ
۱۹۵ مٹ ہون میں بھیگی یلکیں
۲۰۰ شاعر کو غائبانہ چاہنے والی ایک معصوم لڑکی
۲۰۱ حیدرآباد میں بھیجی جہنی مشاعرے

○ رشتوں کی جہک (منہ بولی نہیں)

- ۲۰۴ عظمت عبدالقیوم
۲۱۳ صالحہ الحاف

سرگزشت دل

ایک دن مجھے صدر شعبہ اُردو گلبرگہ یونیورسٹی پروفیسر عبدالرزاق فاروقی کی ایک شغیلی تحریر ملی جس کے ذریعہ مجھے اس بات کی اطلاع دی گئی کہ گلبرگہ یونیورسٹی نے شعبہ اُردو گلبرگہ کے ایک طالب علم حضور تاجہ معین الدین کو میری (صلاح الدین نیکی) مشاعرہ زندگی پر مقالہ لکھنے کی اجازت دی ہے۔ اس سلسلے میں مجھ سے فاروقی صاحب نے خواہش کی کہ میں اس طالب علم سے مقالہ کی تکمیل کے سلسلہ میں ہر ممکنہ تعاون کر دوں۔

گلبرگہ یونیورسٹی کے اس فیصلے کے بعد میں نے اپنی ۳۰ سالہ مشاعرہ زندگی کا جائزہ لیتے ہوئے اپنی حیات کے اُن اوراق کو بھی اُلٹنا شروع کیا جو میری تشو و غما، ارتقاء اور ذہنی حریت میں کلیدی رول ادا کر چکے ہیں۔ میں نے اپنی بکھری ہوئی حیات کے ایک ایک لمحہ کو سمیٹ کر اُس طالب علم کے حوالے کیا۔ کچھ دنوں تک اس طالب علم کا مجھ سے ربط رہا اور وہ سب کچھ اُملا لکھائے دستاویزی شکل میں۔ حاصل ہوا ایک مقالہ کی تکمیل کے لئے ضروری سمجھا جاتا ہے۔ مختلف نوعیت کے مباحث اور شخصی انٹرویوز میں بعض ایسے واقعات و واردات بھی ضبط تحریر میں لائے گئے جن کو میں تقریباً بھول چکا تھا۔ مقالہ کی صورت گری، تدوین و ترتیب اور میری زندگی کے غمو و غل کے تجزیہ

کے دوران میرے دل میں دفعتاً یہ خیال پیدا ہوا کہ کیوں نہ اپنی خود نوشت لکھی جائے۔ یوں بھی میں نے سوچ رکھا تھا کہ اپنی غزلوں (سفر جاری ہے) اور نظموں (یہ کیسا ورشتہ ہے) کے مکمل انتخاب کی اشاعت کے بعد فرصت کے لمحوں میں خود نوشت لکھوں۔۔۔ میں اس کام کا آغاز کرنا ہی چاہ رہا تھا کہ اچانک سارے شہر میں انسانیت کی بنیاد ہلا دینے والا اپنی نوعیت کا منصوبہ بند قساد پھوٹ پڑا۔ سینکڑوں معصوم دیے گناہ (مرد و خواتین، بچے، جوان، بوڑھے) موت کی آغوش میں چلے گئے اور ہزاروں خاندان بے گھر ہو گئے۔ مسلسل سہی دن ملک کفرورہا۔ شہر کے لوگ اُن دنوں بلا تخصیص مذہب و ذات، فرقہ، خوف و ہراس کے عالم میں اپنے تحفظ کے لئے رات رات بھر جاگتے رہے۔ میرے محلے محلے میں اگرچہ کوئی قابل ذکر حادثہ پیش نہیں آیا لیکن ناگہانی صورتِ حال کا سامنا کرنے کے لئے ہندو اور مسلمان دونوں اپنی اپنی حفاظت کے لئے تیار رہے۔ کرفیو کے زمانے میں فرصت ہی فرصت تھی۔ وقت کاٹے نہیں کھٹا تھا۔ ٹی۔ وی اور ریڈیو سے خبریں سننے کے علاوہ اپنی پسند کی کتابیں پڑھنا ہی وقت گزارنے کا ایک مشغلہ رہ گیا تھا۔ متفرق ادبی کاموں کی یکسوئی کے بعد جب مجھے اپنی ادبی زندگی میں پہلی دفعہ فرصت کا احساس ہوا تو مجھے اپنی خود نوشت لکھنے کا خیال آیا اور میں نے دس، بارہ دن میں زائد ہر ایک سو صفحات لکھ ڈالے۔ کچھ دنوں کے بعد ان کے کچھ اور صفحات کا اضافہ ہوا، پھر نظر ثانی کے بعد کتاب کی ختمات کچھ اور بڑھ گئی۔۔۔ میرے محلے میں ابتداء ہی سے امن کی فضا برقرار رہی۔ محلے کے لوگ نسبتاً سکون و

اطمینان سے رہے۔ راتوں کو محلے کے کبھی لوگ اپنے اپنے گھروں کی چھتوں پر رات گزارتے رہتے لیکن میں اپنے ڈرائسنگ روم میں رات کے ایک دیڑھ بجے تک لکھتا رہتا تھا، ایسا نہیں تھا کہ میں حالات سے بے خبر تھا۔ جب کبھی عور سے جوانی فائرنگ کی آواز سنائی دیتی تو میں بھی چند منٹ کے لئے بھت پر چلا جاتا اور مصرت حال کا جائزہ لینے کے بعد اپنے روم میں واپس آ جاتا تھا۔ میں نے اس کتاب میں حتی الامکان اپنی زندگی کے مختلف گوشوں اور اپنے روز و شب کی سرگرمیوں کو محفوظ کیا ہے۔ اس کے باوجود مجھے احساس ہے کہ بہت کچھ واقعات و واردات شامل ہونے سے رہ گئے ہیں، جن کو ضبط تحریر میں لایا نہ جاسکا۔ میری زندگی کے مختلف النوع گوشوں اور پہلوؤں کو سمجھنے، میری حیات اور شاعری کا جائزہ لینے کے لئے ان اوراقِ زندگی سے بھی مدد مل سکے گی۔ میں نے حتی المقدور زندگی کی مثبت قدروں، قلندرانہ طبیعت، خودداری، رشتوں کی پاسداری، بے لوث محبت کے تقاضوں اور خلوص و مہر کے تحفظ و بقا کی کوشش کی ہے۔

حیدرآباد کی میری زندگی رشتوں کی دھوپ چھاؤں میں گزری ہے۔ کچھ رشتے تو میری زندگی کے لئے جزوِ کل کی حیثیت رکھتے ہیں تو کچھ رشتے معطر فغاؤں کی طرح دل و جان کا حصہ بن چکے ہیں اور کچھ رشتے اپنی شناخت اور پہچان کے لئے معاشرہ کی ریشمی ڈوری میں بندھے ہوئے ہیں۔ ان تمام بننے، سنورتے، ٹوٹے اور بکھرتے رشتوں کے باوجود رشتوں کی مہک، روابط کی پاکیزگی، جذبات کی شائستگی، تقدس، اور ولولتِ قلبی کی ماہیت میں کچھ فرق

نہیں آیا۔ زندگی کے بعض ایسے روشن پہلو بھی ہوتے ہیں جن کی برعکاسیت اور نشاندہی سے بھی انسانی رشتے لازوال ہو جاتے ہیں۔ ایسا بھی ہوتا ہے کہ بعض رشتے اپنی شناخت کے لئے اپنے ہی ماحول میں برسوں اپنی تلاش جاری رکھتے ہیں۔

حساس طبع لوگ جب بھی زندگی کے نازک لمحات کو پیرا بن گلیں سے نوازتے ہیں تو ماحول کی کشمکش اور معاشرے کی نرمی و گرمی سے بھی گذرتے رہتے ہیں۔ ایسے حالات سے جب انسان رفتہ رفتہ مانوس ہو جاتا ہے تو اس کی زندگی میں ایک ایسا وقت بھی آتا ہے کہ انسان اپنی شناخت کے لئے دوسروں کی پہچان کا بھی سہارا لیتا ہے۔ ایسی کیفیات ان ہی لمحات کی دین ہوتی ہیں جو ایک حساس انسان کے حصّہ میں آتی ہیں۔ ان تمام کیفیات کی ایک شکل بھی ہوتی ہے۔ کبھی تو یہ شکل رحمت نواز لمحوں کی صورت میں نقشِ اول بن کر ابھرتی ہے تو کبھی ام ہانی طرزِ حیات کی طرح نقشِ ثانی بن کر ظہور پذیر ہوتی ہے۔ اس پس منظر میں کہیں طلعتِ جسم و جاں اختر شناسی کرنے لگتی ہے تو کہیں عشرتِ زندگی فرزانگی کا تسلسل نظر آتی ہے۔ نقشِ اول جہاں طلعت و نسرين کے اُجالوں اور خوشبو سے تن من کو جھکاتی رہتی ہے تو وہیں نقشِ ثانی عشرتِ فرزانگی سے شامِ دل کو موعظ کر دیتا ہے، زندگی ان ہی نقوش کی چھاؤں میں گزر رہی ہے۔ مجھے جتنا تعلق کلِ تازہ سے ہے اتنا ہی ترخوں کے گلاب سے بھی ہے۔ یہ دونوں میری حیات اور شاعرانہ زندگی سے وابستہ ہیں۔ یہی سلسلہ جب طویل ہو جاتا ہے تو صلم تراش، شکن شکن، رشتوں

کی جہک، خوشبو کا سفر، سفر جاری ہے اور یہ کیسا رشتہ ہے، تک پہنچ جاتا ہے۔

میں نے اس کتاب کو ۵ حصوں میں تقسیم کیا ہے۔

سرچشمہ فیضان (اسلاف کی خوشبو)

گھر آگن

میں نے اس باب میں آٹھ ہمناباد، ضلع بیدر کے قیام و وجود کے پس منظر میں اپنے اسلاف کی ہمناباد میں آمد، خاندانی تسلسل، بچپن، تحصیلِ کود، شرارتوں، محبتوں اور اپنی ابتدائی تعلیم و تربیت کی تفصیل پیش کی ہے۔ میں نے اپنی زندگی کے ایسے واقعات بھی قلم بند کئے ہیں جن کے مطالعہ سے میری ذہنی، فہمی، ہنسی زندگی اور میرے سیکولر مزاج ہونے کا پتہ چل جاتا ہے۔ یہ کتاب میری حیات کے مختلف پہلوؤں اور زاویوں کو سمجھنے کے لئے ایک دستاویزی شکل کی حیثیت رکھتی ہے۔ میں نے کتاب کے ہر حصہ میں طوالت کے خیال سے اگرچہ مکمل تفصیلات سے گریز کیا ہے لیکن کوشش کی ہے کہ مختصر ہی کسی اپنی بات قارئین تک صحیح شکل میں پہنچ جائے۔ ہمناباد میں اپنے قیام کے زمانے کے بعض یاد رکھے جانے والے واقعات و واردات کے علاوہ اس کتاب میں میری حیدرآباد میں آمد، پولیس کمیشن، علی گڑھ کا سفر اور دیگر واداتی و تہذیبی واقعات بھی طے گئے۔ میں نے کتاب کو ابتدائی طور پر اپنے

خاندان کے بہت سے افراد کو ایک شجرہ کی شکل میں محفوظ کیا ہے تاکہ بعد میں آنے والی نسلوں کو اپنے بزرگوں اور افراد خاندان کے بارے میں زیادہ نہ سہی کچھ تو واقفیت ہو۔

کارزار حیات :

(ملازمت - اعلیٰ عہدیداروں سے مراسم - ادبی و فلاحی سرگرمیاں)

اس حصہ کتاب میں اپنی ملازمت کی نرمی و گرجی کی تفصیلات ، سکریٹریٹ کے اوسط و اعلیٰ عہدہ داروں ، دوستوں اور ساتھیوں سے روابط اور ان کا مختلف کاموں میں مجھ سے تعاون اور میری شاعرانہ زندگی اور شعروادب سے دلچسپی۔ سکریٹریٹ انسٹو ایشن کی سبنگرہمیوں کی وجہ سے اعلیٰ عہدہ داروں سے میرے دوستانہ روابط ملازم مراسم اور کس کس عہدہ دار نے میری سفارش پر کن کن ضرورت مندوں کی مدد کی ہے ، قلم بند کیا ہے۔

سکریٹریٹ کی زائد از ۳۰ سالہ مدت ملازمت میں بے شمار ایسے واقعات بھی رونما ہوئے ہیں جن میں میری شخصی زندگی کا بے لوث دخل رہا ہے۔ میں نے جہاں کہیں ضرورت محسوس کی ان واقعات کو حوالوں سے ساتھ بیان کیا ہے اور عہدہ داروں کی ان ہر باتوں کا بھی ذکر کیا ہے جن کی وجہ سے بے شمار لوگوں کی زندگی میں بہار آئی۔ ان عہدہ داروں کی عنایتوں کا تذکرہ کرنے کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ میں بے شکل تحریر میں ان کی عظمت کا احترام کروں ، جن کی انسانیت و بھڑکی کی وجہ سے بے شمار مستحق اہل غرض اصحاب

سے تعاون ممکن ہو سکا۔ اور جہاں تک میرے تعاون کی بات ہے، میں نے واضح طور پر یہ کہا ہے کہ سکرپٹس کی ملازمت کے دوران میرا رویہ بعد سلوک اپنے دوستوں اور علمی و ادبی سرگرمیوں کے بارے میں کس طرح کا رہا ہے۔

علمی، ادبی و تہذیبی سرگرمیاں

کتاب کے اس گوشے میں میرے حیدر آباد آنے کے بعد سے آج تک جن علمی، ادبی و تہذیبی انجمنوں اور اداروں سے میری وابستگی رہی ہے، ان کا اجمالاً ذکر ہے۔ ان اداروں سے وابستگی اور سرگرمیوں کے اظہار کا مقصد یہ بھی ہے کہ یہ بتا دے کہ یہ چند محکمہ کن کن حالات، معاملات اور منزلوں سے گزرتا رہا ہوں۔

خوشبو کا سفر

مجھے یاد ہے کہ جب میرا پہلا مجموعہ کلام ’گلِ تازہ‘ شائع ہوا تو میں نے فرط مسرت سے کتاب کی پہلی جلد اپنی والدہ محترمہ کی گود میں رکھ دی تھی۔ میری والدہ نے خوش ہو کر مجھے دعائیں دی تھیں۔ شائد ماں کی دعاؤں کا اثر ہے کہ میں نے رشتوں کی جہک کو محسوس کرتے ہوئے خوشبو کا سفر جاری رکھا۔ یہ گوشہ میری شاعرانہ زندگی سے تعلق رکھتا ہے۔ اسی حصے کے

معاوضہ سے قارئین کو میری شاعری کے خط و خال کا صحیح اندازہ ہوگا۔

رشتوں کی مہک (منہ بولی بہنیں) :

مجھے اپنی حقیقی بہنوں سے جتنی محبت ہے، اتنی ہی محبت اپنی منہ بولی بہنوں سے بھی ہے۔ حقیقی بہنوں کی معصوم و خاموش محبت جہاں گاہوں کی پُر کیف فضاؤں میں رس گھولتی رہی وہیں منہ بولی بہنوں کا میلے لوت محبت، شہر کی پُر رونق، نکھری سُستھری، پاکیزہ، کیف آور، شائستہ تنگفتہ، دل و جان کو معطر کرنے والی محفلوں اور مہذب ماحول کے لئے سرمایہ حیات ہے۔ اُن کی محبت میں سلاگی، والہانہ پن ہے تو اُن کی محبت میں سپردگی اور بے ساختگی ہے۔ اُس والہانہ پن اور اس بے ساختگی کے نازک، لطیف اور پُر اثر کیفیات میں اکثر گذر تار بٹتا ہوں۔

گاہوں کی جیسی بھیجی فضاؤں میں جن بہنوں کے پیار نے میری زندگی کے ابتدائی زمانے میں میرے کردار اور میری شخصیت کو بناتے میں اہم حصہ ادا کیا ہے، اسی طرح جب میں شہر آیا تو شہر کے ماحول میں میری منہ بولی بہنوں نے زندگی کی رعنائی، فطرت کی خوبصورتی، ماحول کی تروتازگی اور معاشرہ میں پھیلی ہوئی خوشبو کا احساس دلایا ہے۔ کیسج تو یہ ہے کہ بے غرض اور بے لوث پاکیزہ رشتے اُن عظمتوں اور شرافتوں کو بھی زبان دیتے ہیں جو ستائے، نوا و از میں بدل دیتے ہیں۔ بے لوث پاکیزہ رشتوں کا یہ

دل دوست میرے خادوں کو تاحیات بہکاتا رہے گا۔

کتنا یہ کامیابی آخری حصہ لطیف و نازک جذبوں، پاکیزہ و
مقدس رشتوں، دل و دماغ میں گھر کرنے والی مہارتوں اور فکر و خیال
کا گھر سے تسلسل رکھنا ہے۔ اس حصہ میں، میں نے رشتوں کی صداقت
و تازگی، پاکیزگی و شگفتگی کی ایسی واضح اور شاعرانہ تصویر کشی ہے کہ رشتوں
کے احترام میں اور اضافہ ہوا ہے۔

جہاں میں نے اپنی منہ بولی بہنوں کی بے لوث چاہت، محبت،
قدیم مہمانی اور پاسداری میں اپنی عمر کا ایک بڑا حصہ گزارا ہے، وہیں ان کی
زندگی کو سزا دینے کے بہترین مستقبل کے لئے بھی پُر غلوں کو شش
کی ہے۔ دیانت داری کے ساتھ بعض بہنوں کے ان احسانات کا بھی ذکر
کیا ہے جس کی ناکامی نے میری زندگی کا رخ ہی بدل دیا ہے۔ میں نے
برسرِ پیرائے رشتہ کو جو حرف دار وادبِ قلمی کے ترجمان بنے ہوئے تھے
ضبطِ تحریر میں ان کی محبتوں اور مروتوں کو خراجِ عقیدت کیا ہے۔

مصطفیٰ المبین نیئر

یومِ بھوری ۱۹۶۲ء



سرچشمہ فیضان (اسلاف کی خوشبو)

گھر آنگن

مجھے اپنے وطن ہمناباد کے بسائے جانے کی تاریخ، تلاشِ بسیار کے بعد بھی نہ تو یہ شکل محفوظ ملی اور نہ ہی یہ شکل کتاب، البتہ ہمناباد کے ایک معمر بزرگ بسونیا گڑھی نے جو (۹۰) برس کے ہوں گے، ایک ملاقات میں کہا کہ راجہ رام راجپندر نے ۱۱۲۸ھ میں ہمناباد کے نام سے ایک شہر بسایا تھا۔ ہمناباد کے آباد ہونے کے بارے میں، میں نے اپنے دو پھوپھی زاد بھائی الحاج محمد عبدالشکور اور الحاج محمد غوث محی الدین صاحب کے علاوہ اپنے بچپن کے دوست اور اسکول کے ساتھی مشہور و معروف ایڈووکیٹ مسٹر ویریکشیا سے بھی معلومات حاصل کیں۔

کہا جاتا ہے کہ ہمناباد کا نام پہلے جے سنگھ نگر تھا، بعد میں نظام کے دور حکومت میں ہمالیوں نامی کسی شخص کے نام کی مناسبت سے ہمناباد کے نام سے مشہور ہوا۔ ایک روایت یہ بھی مشہد ہے کہ ہمناباد کا نام ہنود آباد تھا جو بعد میں ہمناباد کے نام سے شہرت پا گیا۔ ہمناباد میں انگایت طبقہ کے ہندو رہتے تھے۔ ہمناباد کا قلعہ، فیصل اور مشہور دیول ویر بھدریشور ایک ساتھ تعمیر ہوئے ہمناباد کی فیصل کے چھ دروازے تھے۔ ہمناباد کی آبادی پہلے فیصل کے اندر تھی، سارا ہمناباد فیصل سے گھرا ہوا تھا۔ رفتہ رفتہ فیصل کے باہر بھی لوگ بسنے لگے جو

بعد میں کئی محلوں میں تقسیم ہو گئے۔ فیصل کے دروازوں پر سخت پہرہ رہتا تھا۔ ہر مکان پر ایک توپ نصب تھی۔ ایک بڑی توپ نظام کے دور حکومت میں بیدر کو ختم کی گئی۔ پہلے راجہ کا پایہ تخت بھاگی تھا۔

جب راجہ کو ایک شہر بسانے کا خیال آیا تو روایت ہے کہ راجہ سے کسی ست، سادھو یا کسی صوفی بزرگ نے یہ کہا کہ قریب ہی گاؤں میں ناگپا درزی اور کئی عین ناگپا رہتی ہے (جو پتی ورتا ہے) اگر اُن کے ہاتھوں ہمناباد کا سنگ بنیاد پھوٹے گا تو ہمناباد بس جائے گا۔ چنانچہ راجہ نے ایسا ہی کیا۔ راجہ نے سب سے پہلے ٹرسٹل کے ساتھ کاروں اور وہاں کے عام لوگوں کو بسایا۔ راجہ نے انہیں مکان بنانے کیلئے مفت زمین دینے کے علاوہ دیگر کئی سہولتیں مہیا کیں۔ ۱۲ سال تک ہر قسم کا ٹیکس بھی معاف کیا۔

اس وقت ہمناباد کی فیصل اپنے آثار کھوپچی ہے۔ ٹوٹی پھوٹی حالت میں ہے۔ لوگوں نے اپنے مکانات کی تعمیر کے لئے فیصل سے کالے پتھر نکال لئے ہیں۔ فیصل کے اندر جو محلے آباد ہیں، اُن کے نام یہ ہیں۔ محلہ کفر توڑ، باغبان محلہ، بی بی الافہ، توپ گلی اور سید محلہ۔ فیصل کے باہر جو محلے آباد ہیں، اُن کے نام یہ ہیں، محلہ شیوپور، محلہ قصاب، محلہ گاؤ قصاب، محلہ زیر پیٹ اور محلہ نور خاں اکھاڑہ۔ ہمناباد کی یہ تاریخ سجد بہت قدیم ہے جو محلہ توپ گلی سے متصل ہے۔ ہمناباد کی آبادی اس وقت تقریباً ۳۵ ہزار افراد پر مشتمل ہے۔ یہاں کے لوگ زیادہ تر تجارت پیشہ ہیں، زراعت بھی کرتے ہیں۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کی آبادی کا تناسب تقریباً برابر ہے۔ لوگ آپس میں فرقہ وارانہ کجہمتی کے ماحول میں رہتے ہیں۔ یہاں کبھی بھی فرقہ وارانہ فسادات

نہیں ہوئے، ہندو مسلم آپس میں رشیر و شکر کی طرح رہتے ہیں۔ یہاں کے روزمرہ کی زبان اردو اور کنڑی ہے۔ یہاں کے رہنے والے اپنے اسلاف کے نقش قدم پر چلتے ہوئے شریفانہ زندگی گزار رہے ہیں۔

میرے بزرگ خاندان، حضرت سید قطب الدین حسینی بخاریؒ کے معتقدین میں سے تھے، جن نے ہمراہ وہ بیدار سے ہمناباد آئے تھے۔ ہمناباد میں بسنے والے مسلمانوں کا پہلا خاندان میرا انھیال ہے۔ میرے پڑناں جناب محی الدین رشیم کی تجارت کرتے تھے۔ میرے جد اعلیٰ تاجر تھے، بعد میں وہ زمین دار بھی ہو گئے۔

حضرت سید قطب الدین حسینی بخاریؒ، راجہ رام چندر کی خواہش پر میرے سے ہمناباد آئے۔ راجہ رام چندر، حضرت سید قطب الدین حسینی بخاریؒ کا عقیدت مند تھا۔ ہمناباد میں رہنے کے لئے اُس نے انہیں ایک مکان بنا کر دیا اور عبادت کے لئے ایک مسجد بنوائی۔ مسجد کے متصل ایک چبوترہ پر محرم میں علم استادہ کئے جاتے تھے، جس کی روشنی وغیرہ کے انتظامات خود راجہ کرتا تھا۔

حضرت سید قطب الدین حسینی بخاریؒ پہلے مسلمان ہیں جو ہمناباد میں سب سے پہلے تشریف لائے۔ انہوں نے اپنے محلہ کا نام محلہ کفر توڑ رکھا۔ ان کی آخری آرام گاہ محلہ کفر توڑ کی مسجد کے احاطہ میں ہے۔ اس خاندان کے دو بزرگ بھی ہیں۔



قلعہ ہمناباد (ضلع بیدر) میں ہمارا خاندان ابراہیم بھائی کے نام
 سے مشہور ہے۔ میرے دادا سراج الدین کے سات بیٹے تھے اور تین بیٹیاں
 ہنسب بی، کریم بی اور فیض بی تھیں۔ میرے والد محترم الحاج محمد شمس الملکین
 اپنے محل میں سب سے چھوٹے تھے جو ابتداء میں ریشم کی تجارت کرتے تھے
 ہمناباد کے آس پاس کے بیوپاری ان سے ریشم خرید لیا کرتے تھے۔ میری دلدی
 وزیر بی صاحبہ میرے والد کے ساتھ رہا کرتی تھیں۔ میرے والد اپنی ماں کی
 بہت زیادہ خدمت کرتے تھے، شاید یہی وجہ ہے کہ خداوند تعالیٰ نے انہیں
 نہایت خوشحال اور نیک نام رکھا۔ ان کے گھرانے میں روز بروز ترقی ہوتی گئی۔
 میرے والد ہمناباد کے اولین طالب علموں میں شمار کئے جاتے ہیں۔ حج
 کے سفر میں بن کے ہمراہ ہمناباد کے دو اور اصحاب محمد حسین اور عبد القادر صاحب
 تھے۔ حج سے واپسی کے بعد میرے والد اور ان کے دوست محمد حسین صاحب نے
 مشترکہ طور پر کپڑے کی تجارت شروع کی۔ والد محترم نہایت دیانت دار،
 نیک دل، ایماندار اور خدا ترس انسان تھے، جو میرے محلہ کھنٹوڑ والاہ کی مسجد
 کے پیش امام اور خطیب تھے وہ جامع مسجد ہمناباد میں بھی امامت کرتے تھے۔
 ان کا زیادہ تر وقت مذہبی مصروفیات، فلاحی کاموں اور عبادت میں گھبراتا
 تھا۔ میرے والد کی تین بیویاں تھیں۔ پہلی بیوی کا نام بی بی بی، دوسری بیوی

کا نام قاسم بی اور تیسری بیوی کا نام رقیہ بی تھا۔ میری سوتیلی والدہ سے کوئی اولاد نہیں ہوئی۔ ہم تمام بھائی بہن والد محترم کی تیسری بیوی رقیہ بی کی اولاد ہیں۔ میرے والدہ میری چھوٹی فیض بی کے اصرار پر اولاد کی خاطر تیسری شادی کی تھی۔ چار بیٹے مجھ سے بڑے ہیں، دوسری بہن وزیر النساء کا انتقال ہو چکا ہے ہم چار بھائی الحمد للہ بقیہ حیات ہیں۔ میرے والد کی تعلیم غریبی ماحول میں ہوئی تھی، وہ اپنی نیک صلت، شرافت، مروت اور رحمہ لہ کی وجہ سے حاجی صاحب کے نام سے جانے جاتے تھے۔ ان کا ہاتھ بہت کشادہ تھا۔ وہ غریبوں، یتیموں اور یتیم خانوں کی مدد کیا کرتے تھے۔

میری والدہ رقیہ بی کی تربیت میں میری چھوٹی فیض بی کی دلچسپی کو بہت زیادہ دخل دے رہا ہے۔ میری والدہ ان کے دیود عبد الحمید کی بیٹی تھیں۔ میرے چھار بہنوئوں میں دوسرے پھوپھی عبدالحق صاحب میرے چھوٹی زاد بھائی بھی تھے جو میرے والد کے انتقال کے بعد ہمارے سرپرست رہے اور والد کی تجارت کے کامدار دیکھ لیا کرتے تھے۔ جب میرے والد کا ۴۰، ۴۲ سال کی عمر میں انتقال ہوا تو میری عمر ۵ یا ۶ برس کی ہوگی۔ مجھے صرف اتنا یاد ہے کہ اس رات گھر کے ایک کمرہ میں مجھے سویا گیا تھا۔ میرے والد کا انتقال حیدرآباد میں ہوا، جنھیں ہمناباد سے علاج کے لئے حیدرآباد لے جایا گیا تھا۔ میں نے اپنے والد کی مصورت بھی نہیں دیکھی، البتہ ان کی شہیہ کی ایک جھلک میری نظروں میں چھو رہی ہے۔ مجھ کو صحت اور مصورت مند انسان تھے۔ والد محترم کے انتقال کے بعد میرے چھوٹوں اور چھوٹی زاد بھائیوں نے مجھے ہمدی سرپرستی کی (ان کی سرپرستہ عرف

تربیت کی حد تک تھی، معاشی سرپرستی کا سوا اس لئے نہیں تھا کہ میرے والد کے پاس وہ سب کچھ تھا جو ایک خوشحال خاندان کے لئے ضروری ہوا کرتا ہے۔

میرے دو حصال کے زیادہ تر لوگ زمیندار اور زراعت پیشہ تھے، لیکن

ایسا زیادہ افراد تجارت پیشہ بن گئے ہیں، کچھ افراد سرکاری ملازم بھی ہیں۔ دو حصال کے افراد میں غلام نبی، یسین علی، شان علی، محمد حسین، امیر الدین، مستان علی، عبدالقادر، حبیب الدین، نصیر الدین، عبدالکریم، محمد حنیف، محمد اسماعیل، حسام الدین، علیم الدین، نعیم الدین، حبیب الدین اور غوث محی الدین قابل ذکر ہیں۔ ہمارا گھر دو حصال کے تمام افراد خاندان کے مقابلے میں زیادہ خوش حال اور معاشی اعتبار سے مستحکم رہا۔ میرے تمام تایاؤں کی تعلیم مذہبی تعلیم کی حد تک محدود رہی۔ البتہ میرے پہلے اہلیق میرے ایک تایا حیدر علی نسبتاً زیادہ پڑھے لکھے تھے لیکن ان کی تعلیم بھی دینیات اور اخلاقیات کے زمرہ سے تعلق رکھتی تھی۔ میرے بچپن میں ہمناباد میں صرف ایک خانگی مڈل اسکول تھا جس کے بانی محمد عبدالسلیم صاحب تھے۔ ہمناباد کے لوگوں میں تعلیمی شعور پیدا کرنے کے سلسلے میں عبدالسلیم صاحب نے ناقابل فراموش کارنامہ انجام دیا تھا۔

میرا تہنعال پیشکار صاحب کے گھرانے کے نام سے مشہور ہے۔ میرے تانا عبدالحمید صاحب کا تعلق پیشہ طبابت سے تھا۔ میرے چھوٹا بھائی خواجہ میرے تانا کے بڑے بھائی تھے وہ وقار الامراء پائیگاہ کے پیشکار تھے۔ میرے چار بچے ماموںوں میں بڑے ماموں عبدالجہد صاحب کا انتقال ہو چکا ہے (علی الدین کوید اور ڈاکٹر علیل تنویر ان ہی کے نواسے ہیں) یہ تحصیل ہٹی کھڑ پائیگاہ میں صیغہ وارتے اور انھیں تحصیل

نارائن کھڑ سے ولیفہ حسن خدمت جاری ہوا تھا۔ ان کے پانچ بیٹے مقبول احمد، عبدالصمد، عبدالسلام، عبدالرفیق اور عبدالجلیل اور چھ بیٹیاں عظمت بانو (والدہ علی الدین نوید)، فیض بانو (والدہ ڈاکٹر جلیل تنویر)، امیر بانو، حوراں بانو، حسنت بانو اور سلیمہ بانو ہیں۔ دیگر تین ماموں میں عبدالوحید صاحب کے دو بیٹے مطلب الدین، رفیع الدین اور تین بیٹیاں ریم النساء (ابلیہ فیاض الدین) خالدہ بیگم، ساجدہ بیگم ہیں۔ تیسرے ماموں عبدالحق صاحب کے سات بیٹے شمس الحق، نورالحق (مروم)، نورالحق، قیام الحق، ممتاز الحق، فیدار الحق، مظہر الحق اور تین بیٹیاں حمیدہ بانو، شمیم سلطانہ اور فریدہ لسنی ہیں، چوتھے ماموں عبدالخالق صاحب کو ایک بیٹا وصی الحق اور ایک بیٹی سنجیدہ بانو ہیں میری تین خالوں سلیم بی، مریم بی اور احمد بی کا انتقال ہو چکا ہے۔

نیکھال کے اقراء عائدان میں عبدالرزاق پیشرو، امام، عبدالواحد، عبدالقیوم، عبدالرشید، عبدالواحد، عبدالغنی، عبدالعزیز، عبدالسلیم، قمر الدین، کریم الدین، سلیم الدین اور عبدالغفار (فقیر صاحب) قابل ذکر ہیں۔ اللہ شریف میں میرے رشتے کے دو ماموں عبدالسلیم صدر مدرس اور بشیر الدین تاجر تھے۔ عبدالسلیم پاکستان چلے گئے ان کے چار بیٹے امین الدین، سید احمد علی الدین، عاتقی صلاح الدین اور منسا، لڑکیوں میں رضیہ اور زاہرہ ہیں۔ بشیر الدین اللہ میں ہی چھوند خاک ہو گئے۔ ان کے تین بیٹے ظہیر الدین، منیر الدین اور نصیر الدین اور دو بیٹیاں ہیں۔

پھوپھی زہد بھائیوں میں عبدالحفیظ، الحاج محمد حبیب الدین، الحاج عبدالغفور، الحاج عبدالشکور اور الحاج غوث محی الدین شامل ہیں، جن میں اول الذکر تین پھوپھی زاد بھائیوں کا انتقال ہو چکا ہے۔ عبدالحفیظ محکمہ پولیس (حیدر آباد) میں محرز تھے۔

جن کے تین لڑکے عبدالعزیز (مرحوم)، خواجہ مصحف الدین اور عبدالسلیم ہیں۔ پانچ لڑکیوں میں بی جانی، پاشاہ بی، لطیفہ، سلیمہ اور عائشہ شامل ہیں۔ عبداللطیف صاحب کی دو بیویاں (صاحب بی اور حقیقہ بی) تھیں۔ میرے خسر الحاج محمد حبیب الدین اللہ شریف (ضلع گلبرگہ) میں عدالت منصفی میں میںغدار تھے جو وظیفہ حسن خدمت پرسبکدوشی کے بعد ہمناباد کے محلہ شیوپور کی مسجد حرم کے پیش امام مقرر ہوئے اس مسجد میں وہ چھوٹے بچوں اور بچیوں کو ابتدائی دینی و مذہبی تعلیم دیتے تھے۔ الحاج عبدالغفور حکیم اور تاجر ہونے کے علاوہ محلہ کفر توڑ کی مسجد کے پیش امام تھے الحاج عبدالشکور ایک کامیاب تاجر ہیں۔ غوث محی الدین صاحب (میرے بڑے بہنوئی) سرکاری ملازم تھے۔ میرے نفعیہاں میں دس افراد کو حج بیت اللہ اور نیارت بانگاہ مصطفویٰ کا شرف حاصل ہو چکا ہے، جن کے نام یہ ہیں۔ محمد غوثیہ، عبدالحمید، محمد حبیب الدین، عبدالشکور، عبدالغفور، غوث محی الدین، عبدالحق، محمد ظہیر الدین (فرزند غوث محی الدین)، واجدہ بی (ابلیہ غوث محی الدین) میرے والد الحاج محمد شمس الدین کی اولاد میں چار بیٹیاں اور چار بیٹے ہیں۔ تمام بہنیں مجھ سے بڑی ہیں (جن میں سے ایک بہن وزیر النساء کا انتقال ہو چکا ہے)۔ چار بیٹوں میں صلاح الدین نیر، محمد ضیاء الدین، محمد فصیح الدین، محمد فیاض الدین، اور بہنوں میں حور النساء، وزیر النساء، حلیمہ بی اور قریشہ بی پندرہ بھائیوں میں سب سے بڑا میں ہوں۔ میرا دوسرا بھائی محمد ضیاء الدین ریاست کرناٹک کے قلعہ سیٹم (گلبرگہ) میں، بحیثیت منبر بلاک ڈیولپمنٹ ڈپارٹمنٹ سے وابستہ رہا ہے۔ اس کی شادی میری پہلی والدہ بی بی کے بھائی محمد اسماعیل متوطن چنگوہہ کی دوسری

لڑکی عبیدہ بیگم سے ہوئی۔ ضیاء الدین کے چھ بیٹے شجاع الدین شکیل، رفیع الدین جمیل، غیاث الدین عقیل، شہاب الدین قتیل، علیم الدین عدیل، عماد الدین عتیق، اور چھ بیٹیاں نصرت رضوانہ (اہلیہ محمد ظہیر الدین)، ریحانہ رفعت، عظمت شاہانہ (اہلیہ خواجہ عین الحق)، نکمت فاطمہ (اہلیہ شجاع الدین)، بشارت تحسین، آریسکن ہیں۔ شجاع الدین شکیل کا ششدر میرے ایک رشتہ کے ماموں غلام رسول صاحب کا لگی کی بیٹی غوثیہ بیگم سے ہوا، جن کے چار بیٹے، سیف الدین، وجیہ الدین، فرار، نعیم الدین معراج، سراج الدین اور ۴ بیٹیاں تبسم، زیبا، نازہ، اسمیٰ ہیں۔ رفیع الدین جمیل کا رشتہ میری بیٹی عشرت عرفانہ سے ہوا، جس کے چار لڑکے مصباح الدین، ہبیل، مفتاح الدین، فیصل، فلاح الدین، فیصل اور راحیل ہیں۔ غیاث الدین عقیل کا رشتہ میرے رشتہ کے بھتیجے غوث غنی الدین کی بیٹی حبیبہ سلطانہ سے ہوا جنھیں ایک لڑکا شمس الدین فیضان ہوا۔

میرا تیمر بھائی فصیح الدین ہمناباد میں رہتا ہے۔ وہ تجارت کرنے کے علاوہ آبائی زراعت کی دیکھ بھال کرتا ہے۔ فصیح الدین کی شادی میرے والد محترم کے بزنس پارٹنر اور سفر حج بیت اللہ کے ساتھی محمد حسین صاحب کے بڑے صاحبزادے محمد شفیع کی بڑی لڑکی خیر النساء سے ہوئی جن کے تین بیٹے مسیح الدین، محمود، معز الدین، علی الدین اور چھ بیٹیاں فرحت قرمانہ، راحت رخسانہ، نزہت زبدینہ عائشہ پروین، حنا حسین اور حمیرہ ہیں۔ مسیح الدین محمود کی شادی عبدالحمید صاحب کی دختر فرزانہ سے ہوئی، انھیں ایک بیٹا عبداللہ زبیر اور ایک لڑکی اسری ہے۔ میرا چوتھا بھائی محمد قیاض الدین ساوٹھ سنٹرل ریلوے سکندر گاد سے وابستہ

ہے، جہاں انجینئر سکشن میں ہیڈ ڈرافٹسمن کی حیثیت سے کارگزار ہے۔ فیاض الدین کی شادی میرے قیسے ماموں عبدالوحید کی بیٹی رحیمہ سے ہوئی۔ ان کے دو لڑکے صفی الدین (انجینئر) اور ذکی الدین ہیں، اور ایک لڑکی انیس فاطمہ (ریشمال) ہے۔

ہمتا باویں ہمارا گھر ایک باڑے کی شکل میں ہے۔ میری دوسری والدہ قاسم بی صاحبہ کی حیثیت ایک سربراہ خاندان جیسی تھی جو ہماری برادری کے تمام چھوٹے بڑے مسائل کو سنبھالیا کرتی تھیں۔ خاندان کی خواتین اور محلہ کی دوسری خواتین اپنے گھریلو مسائل کے سلسلہ میں میری والدہ سے مشورہ کیا کرتی تھیں۔ جاڑ کی راتوں میں میری والدہ انگلیٹی سٹک کر بیٹھ جاتیں۔ ان کے اطراف خاندان کی خواتین گھنٹوں بیٹھی رہتی تھیں۔ یہ سلسلہ ۹ بجے شب سے شروع ہو کر رات کے تقریباً ۱۲ بجے تک چلتا رہتا۔ میری والدہ باڑے اور پُرقرار شخصیت کی مالک تھیں۔ میرے گھر کی ایک خاص بات سارے قبیلے اور سارے ہمتا باد کے لئے مثالی تھی اور وہ یہ کہ تینوں والدہ کے آپس میں ہمیشہ خوشگوار تعلقات رہے، وہ سب ہنسی خوشی کے ساتھ مل جل کر رہا کرتی تھیں۔ ہم تمام بھائی، بہنیں اپنی دونوں ماؤں کے بے حد لاگو تھے۔ ہم نے کسی وقت بھی یہ محسوس نہیں کیا کہ ہماری کون سی ماں حقیقی ہے اور کون سی سوتیلی۔ ہم سب ایک ہی گھر میں رہتے تھے۔ کچھ تو یہ ہے کہ ہم اپنی حقیقی ماں کے ساتھ ساتھ ان دونوں سوتیلی ماؤں کو بھی بے حد چاہتے تھے، وہ دونوں بھی ہم سب کو ٹوٹ کر چاہتی تھیں۔ میری بڑی والدہ بی بی نہایت خوبصورت، ذہنی پستلی نازک، اوسط قد کی خاتون تھیں جن کا میرے بچپن میں انتقال ہوا۔ وہ میری بڑی بہن محمد النساء کو نسبتاً زیادہ چاہتی تھیں۔ بڑی بہن زیادہ تر

انہیں کے پاس رہتی تھیں، اسی طرح میری دوسری ماں قاسم بی میری دوسری بہن
 ذریعہ انسا کو بہت چاہتی تھیں مگر مجھے دونوں والدہ بے حد عزیز تھیں۔ میری
 بڑی والدہ چنگو پہ (معین آباد) کی رہنے والی تھیں۔ میرے معین آباد کے رہنے والے
 ماموں محمد اسماعیل کھڑے کے بیوی پارے تھے جو میرے بچپن میں کپڑا فروخت کرنے
 کے لئے ہمناباد کے بازار کے دن آتے تھے اور ہمارے ہاں ٹھہرتے تھے۔ کبھی کبھی میں
 اُن کے ہمراہ اُن کے گھوڑے پر بیٹھ کر چنگو پہ چلا جاتا تھا۔ چنگو پہ کا فاصلہ ہمناباد
 سے چھ میل کا ہے۔ ہر سال وہاں کے بزرگ حضرت کبیر اللہ قادریؒ اور حضرت سالار
 محمدؒ کا شاندار پیمانے پر عرس ہوتا تھا۔ اس موقع پر ہر سال عرس شریف کی
 تقریب میں ضرور شرکت کرتا تھا۔

چنگو پہ میں میرے ماموں کے پڑوسی کے پاس مختلف رنگ کے کبوتر
 تھے۔ میں جب بھی جاتا وہاں سے دو چار کبوتر اپنے ساتھ لے آتا۔ مجھے سفید کبوتر
 بے حد پسند تھے۔ اپنے گھر سے متصل اپنے چچا غلام نبی صاحب کے گھر کے بڑے نیم
 کے درخت پر ہانڈیاں اور گھڑے بندھواتا اور انہیں اُن میں رکھواتا۔ دیکھتے ہی
 دیکھتے کبوتروں کا اضافہ ہو جاتا۔ جب کبوتر اُڑ جاتے تو اپنے ہمراہ ایک دو کبوتر
 فرور لاتے۔ ان کبوتروں میں ایک کبوتر جو سفید رنگ کا تھا اور جس کے پاؤں
 نہایت سرخ تھے۔ میں نے جہا جہن ماندھے تھے۔ وہ مجھے دیکھتے ہی میرے کندھے
 پر بیٹھ جاتا تھا، اُس سفید کبوتر کو مجھ سے لگاؤ سا ہو گیا تھا۔ یہ اُس وقت کی
 بات ہے جبکہ میری عمر بمشکل ۱۲، ۱۳ برس کی ہوگی۔ میرے ماموں محمد اسماعیل
 کے پانچ بیٹوں محمد یوسف، محمد مستان، محمد مشائخ، محمد جعفر اور محمد نوداریں

سے ایک بیٹا محمد جعفر جنیدی پاکستان کا شہری ہے۔ دو بیٹیاں زہیدہ بیگم اور عبیدہ بیگم ہیں۔ چنگوپہ میں میرے بہت ہی اچھے پانچ دوست تھے، ان میں سے ایک تحصیل دار کا لڑکا تھا، دوسرا ایک مشہور وکیل عنایت اللہ کا بیٹا باری، تیسرا چنگوپہ کے قاضی کا لڑکا میر غلام علی، چوتھا میری عمانی زینب بی کی بہن کا لڑکا خواجہ معین الحق جس کے والد عبدالرحیم سرکل انسپکٹر پولیس تھے اور پانچواں میرا ماموں زاد بھائی جعفر جنیدی۔ چنگوپہ میں ان دوستوں کے ساتھ میرا زیادہ وقت گذرتا تھا۔ (حیدر آباد آنے کے بعد چنگوپہ کے ایک اور ساتھی عبدالرحیم سے میری شناسائی بڑھی)۔ میری بڑی والدہ نے اپنے خاندان کے تسلسل کینے اپنے بھائی کی دوسری لڑکی عبیدہ بیگم سے میرے دوسرے بھائی محمد ضیاء الدین کا رشتہ کیا۔ میرے بچسن ہی میں میری دونوں والدہ کا انتقال ہو گیا۔ پولیس ایشن کے بعد میری بڑی والدہ کے خاندان کے بیشتر افراد حیدر آباد آ گئے۔ میری دوسری والدہ قاسم بی ہمناباد کے ایک محلہ قوہ پگلی کے ایک پھرزا خاندان سے تعلق رکھتی تھیں۔ ان کے خاندان کے افراد اب بھی اسی محلہ میں رہتے ہیں، جو میرزا گھرانے کے نام سے مشہور ہیں، جن میں قابل ذکر پھرزا فقیر بیگ، ہتتاب بیگ، ڈاکٹر منہویگ، یحسان بیگ، امجد بیگ، محمد بیگ، عتیق بیگ، ڈاکٹر فاروق بیگ، انور بیگ وغیرہ ہیں۔ میری دوسری والدہ قاسم بی نے اپنے خاندانی سلسلہ کو استوار رکھنے کے لئے اپنے ایک رشتہ دار کے لڑکے میرزا ہتتاب بیگ سے میری تیسری بہن حلیمہ بی کی شادی کمرادی۔ میری بڑی بہن خور النساء میرے چھوٹی زاد بھائی غوث علی الدین کے رشتہ ازواج میں آگئیں۔ دوسری بہن وزیر النساء میرے

بیوی زاد بھائی عبدالحق صاحب سے منسوب ہوئیں۔ چوتھی بہن قریشہ بی
 محلہ بی بی لالہ کے رہنے والے عبد الجلیل صاحب سے منسوب ہوئیں جو میرے بہنوئی
 عزیزنا ہمتاب بیگ کے رشتہ دار تھے۔ میری بڑی بہن حور النساء کے دو بیٹے اور
 چھ بیٹیاں ہیں۔ پہلا لڑکا محمد ظہیر الدین (مقیم ہمناباد) ڈپلوما ہولڈر میکانک ہے
 جس کی شادی میری چھٹی بیٹی سمی نسرت رضوانہ (دختر محمد ضیاء الدین)
 سے ہوئی۔ اس کے ۴ لڑکے ظہیر محی الدین، ظہیر محی الدین، مظہر محی الدین اور
 ظفر محی الدین، دو لڑکیاں زینت فرزانہ اور حمیرہ بتول ہیں۔ دوسرا لڑکا محمد مظہر الدین
 حیدر آباد میں مقیم ہے جو بزنس میں ہے، جس کی بیوی شہناز بانو ہمارے ایک
 رشتہ دار غلام جیلانی کی لڑکی ہے۔ ان کے پانچ لڑکے عرفان محی الدین، رضوان
 محی الدین، عمران محی الدین، فرمان محی الدین اور امان محی الدین ہیں۔ میری بہن
 حور النساء کی چھ بیٹیاں ہیں حافظ بانو، سردار بانو، افضل بانو، محنت بانو،
 بلقیس بانو اور نثار بانو شامل ہیں۔ میرے بہنوئی الحاج غوث محی الدین
 حیدر آباد میں مقیم ہیں، سرکاری ملازمت سے وظیفہ حسن خدمت حاصل کرنے کے
 بعد خانگی طور پر کچھ تجارت ہمیشہ محفرت کے کھاتوں اور حساب کتاب کی تیق
 کیا کرتے ہیں۔ غوث محی الدین محکمہ ہندوستان میں انسپکٹر لینڈ ریکارڈ تھے۔
 میری دوسری بہن وزیر النساء کو ایک بیٹے خواجہ حسین الحق کے علاوہ ایک بیٹی سلیمہ
 ہوئی۔ خواجہ حسین الحق محکمہ مال ضلع بیدر میں مگر دادر کی حیثیت سے کام کر رہا ہے۔
 اس کی بیوی سلیمہ، غلام رسول صاحب کالنگی کی بیٹی بیٹی ہے۔ انہیں تین لڑکے
 امیس، نسیم، اعجاز اور چھ بیٹیاں کلیم، فہیم، وسیم، عتیقہ، ریشہ اور مرست

ہیں۔ میری بھانجی سلیمہ ۲۵ سال کی عمر میں بیوہ ہو گئی، وہ لاؤلد ہے۔ وہ اس قدر شوہر پرست ہے کہ اُس نے دوسری شادی نہیں کی۔ وہ اپنے بھائیوں کے پاس علحدہ رہتی ہے۔ سلیمہ کی ماں وزیر النساء کے انتقال کے بعد خاندان کے بزرگوں کے اصرار پر اس کے والد عبدالحق صاحب نے دوسری شادی کی۔ دوسری بیوی صغریٰ سے چھ لڑکے خواجہ عین الحق، خواجہ حبیب الحق، خواجہ امین الحق، خواجہ نجیب الحق، خواجہ نور الحق اور خواجہ محب الحق ہوئے اور ایک لڑکی حلیمہ النساء پیدا ہوئی۔ خواجہ عین الحق کا رشتہ میرے چھوٹے بھائی محمد ضیاء الدین کی بیٹی عظمت شاہانہ سے ہوا جو ایک تاجر کی حیثیت سے خوشحال ہے۔ انہیں ایک لڑکا خواجہ عبدالحق جنیدی اور ایک لڑکی وزیر النساء شہار ہے۔

میری دوسری بہن وزیر النساء کا انتقال کم عمر میں ہی ہو گیا، شاید اُس وقت وہ بمشکل ۲۴، ۲۵ سال کی ہوگی۔ اُس کو مرگی کی بیماری تھی۔ مرگی کا دورہ پڑنے کے بعد اپنے گھر کی پخت سے گر گئی اور اس کا انتقال ہو گیا۔ وہ اپنی دوسری بہنوں کی طرح رمضان شریف میں ۳۰ دن روزہ رکھتی تھی۔ کلام پاک اتنی تیزی اور روانی سے پڑھتی تھی کہ بعض دفعہ ایک ہی دن میں کلام مجید ختم کر لیتی تھی۔ رمضان شریف میں کلام پاک کے کم از کم ۱۵ دور ہوتے تھے۔

میری تمام بہنوں میں وہ صحت مند اور خوبصورت تھی لیکن بلا کی فدی تھی۔ ایک دن میری والدہ سے خفا ہو کر میرے چچا غلام نبی صاحب کے گھر میں موجود بہت ادنیٰ نیم کے درخت پر چڑھ کر بالکل آخری ٹہنی کے قریب بیٹھ گئی۔ خاندان کے بہت سے لوگ جمع ہو گئے۔ بہت دیر تک سمجھانے کے بعد درخت سے

نیچے اُتری۔ اس طرح ایک اور واقعہ مجھے یاد ہے کہ میری والدہ کی ڈانٹ ڈپٹ پر ہمارے محلہ سے باہر ایک ویران شکستہ مکان کے خور رو پودوں کے درمیان گھنٹوں چھپی رہی۔ دن بھر تلاش کیا گیا، آخر کار سہر شام اس کو مذکورہ شکستہ مکان سے ڈھونڈ نکالا گیا۔ تمام بہنوں میں ذرا مختلف ہونے کی وجہ سے گھر کے تمام لوگ اس کو بیٹا سمجھتے تھے۔ میری تیسری بہن حلیمہ، نہایت حلیمہ الطبع اور منکسر المزاج، خاموش طبیعت خاتون ہیں، ان کے دو بیٹے مرزا خواجہ بیگ اور مرزا مصطفیٰ بیگ اور چار بیٹیوں میں رفیعہ بیگم، فوزیہ بیگم، غوثیہ بیگم اور ذکیہ بیگم شامل ہیں۔ میری چوتھی بہن فریشہ بیوہ ہے، اس کے مکمل اغراجات کی پابجائی ہم بھائیوں کے تعاون سے ہوتی ہے۔ فریشہ کو ایک لڑکا اسمعیل (حاجی میاں) ہوا تھا، جس کا انتقال ہو چکا ہے۔ دو بیٹیاں حسرت بی اور رشیدیہ بی اپنے سسرال میں خوش ہیں۔

میرے حررگوں میں میرے ایک تایرے چچا غلام نبی صاحب زمیندار میرے والد کے انتقال کے بعد میرے ماموؤں اور چھوٹی زاد بھائیوں کی طرح ہم لوگوں کا خیال رکھتے تھے۔ میرے والد انہیں بہت چاہتے تھے۔ میرے چچا کی بہت بڑی زمین ہے جس پر کاشت کی جاتی ہے اور آم کے بہت سے درخت ہیں۔ چچا کے انتقال کے بعد ان کے بڑے بیٹے عبدالکریم اپنے گھر کے سرپرست ہوئے۔ ان کے دو بھائی تاج الدین اور عبدالرحمن اپنے اپنے انداز سے زندگی گزار رہے ہیں۔ عبدالرحمن ملازم سرکار ہے۔ میرے چچا زاد بھائی عبدالکریم کے منشی نظامیہ تک تعلیم پائی۔ میری بھالی (والدہ نما) عبدالغفور

بمیدر کے ایک علمی گھرانے سے تعلق رکھتی ہیں۔ میرے بھائی عبدالکریم علیہ شہید پور (محلہ قریش) کی ایک مسجد میں امامت کرتے ہیں اور محلے مکے بچوں کو دینی و اخلاقی تعلیم دیتے ہیں۔ ان کے بڑے بیٹے عبدالغفور کی میری بڑی لڑکی طلعت سلطانہ سے شادی ہوئی۔ عبدالکریم صاحب کے دوسرے بیٹوں میں محمد شعیب، محمد ظہیر، کلیم الدین، افضل الدین، عارف الدین اور آصف الدین شامل ہیں۔

کلیم الدین کی شادی حلیم النساء بنت عبدالحمز اجنیدی سے ہوئی۔ عبدالکریم صاحب کی تین بیٹیاں، نور جہاں، یاسمین اور فہمیدہ بیگم ہیں۔ میرے ایک پھوپھی زاد بھائی بشیر احمد جنیدی ہمارے خاندان کے مستعد اور متحرک افراد میں شمار کئے جاتے تھے، وہ میری بے حد حوصلہ افزائی کرتے تھے۔ خاندان کے لڑکوں اور لڑکیوں کے رشتوں کی تلاش میں خاصی دلچسپی لیتے تھے۔ خاندان کے لڑکے اور لڑکیاں ان کی نظر عنایت کے منتظر رہتے تھے۔ ایسا بھی ہوتا تھا کہ خاندان کی لڑکیاں ان کو دیکھتے ہی چُھپ جاتی تھیں تاکہ ان پر ان کی نظر نہ پڑے اور انہیں جلد اپنا میکہ چھوڑنا پڑے۔ ان کے بڑے لڑکے نذیر احمد سے میری بھانجی حافظہ بانو بیابھی گئی۔ بشیر احمد کا ایک اور بیٹا اقبال احمد محکمہ ٹرانسپورٹ سے وابستہ ہے۔ میری ایک تاییری پھوپھی وزیر بنی (ہمیشہ غلام بنی) مجھے بے حد عزیز تھیں، میں اپنے بچپن میں ان کے گھر بہت زیادہ جایا کرتا تھا۔ وہ میری خاطر تواضع میں کوئی کسر اٹھاتا نہ دیکھتی تھیں۔ میرے پھوپیا عبدالقادر صاحب بد میرے والد کی خاص نظر کرم تھی۔ وہ والد کرم کی زندگی میں اور زندگی کے بعد بھی ہمارے گھر کے کام کا جملہ ہاتھ بٹاتے

رہے۔ بہ الفاظ دیگر ہم تمام بہنوں اور بھائیوں کی ذمہ داری کے ساتھ نگرانی کرتے تھے۔ ان کا ایک بیٹا محمد شفیع میرے اولین دوستوں میں سے ہے، جو تجارت کے علاوہ غنیمت، دینی معاملات میں معروف رہتا ہے۔ میرے رشتہ کے ایک ماموں غلام رسول صاحب بھی ہمناباد کے تاجروں میں ایک اچھی پوزیشن کے مالک ہیں۔ میری پھوپھی فیض بی کے بیٹوں میں الحاج محمد عبدالغفور، ہر دل پرورد اور ایک معتبر انسان ہونے کے علاوہ ہندو مسلم اتحاد کی ایک روشن علامت تھے۔ پُرتقار، فصیح جو اور معاملہ فہم تھے۔ خاندان میں ان کا بے حد احترام کیا جاتا تھا۔ تاجر بھی تھے اور حکیم بھی۔ رمضان شریف میں محلہ کفر تھڑ کی مسجد میں تراویح کی غلڑ پڑھاتے تھے۔ وہ اس مسجد کے پیش امام بھی تھے۔ بہت ہی متاثر کن اور اثر انگیز لہجہ میں نماز پڑھاتے تھے۔ ان کی دعویٰ یاں تھیں، زینب بانو اور زیتون بیگم۔ زینب بانو کی ایک لڑکی محمد شہید بانو کا ۱۳ سالہ کی عمر میں انتقال ہوا۔ بچپن میں وہ مجھے دوسری مامولی زاد بہنوں کے مقابلہ میں زیادہ اچھی لگتی تھی۔ زیتون بیگم کے کوئی لڑکا نہیں تھا، البتہ انہیں پانچ لڑکیاں قمر بانو، ظفر بانو، فاطمہ بانو، میمونہ اور صوفیہ ہیں۔ میرے ایک اور ماموں الحاج حبیب الدین (میرے خسر) محلہ اللہ خریف ضلع گجرگہ کی عدالت منصفی میں صیغہ دار تھے۔ انہوں نے اپنی تمام عازمت نیک نامی کے ساتھ گزاری۔ وظیفہ کے بعد انہوں نے ہمناباد میں تجارت شروع کر دی۔ وہ محلہ شیوپور کی مسجد حرم کے پیش امام بھی رہے، جہاں بچوں کو دینی اور اخلاقی تعلیم دیتے تھے۔ وہ ایک صوفی منش اور مجتہد صفت

انسان تھے۔ انہیں ایک بیٹا ہے۔ ہاشم معز الدین جن کی شادی محلہ بی بی الاولاد کے ایک تاجر جداب عبد الحنان کی بیٹی عطیہ بیگم سے ہوئی۔ میرے ماموں الحاج حبیب الدین کی پانچ لڑکیاں ہیں (جن میں رشیدہ بانو (پتلی)، اشرف بانو اور عظمت بانو کا انتقال ہو چکا ہے)۔ ان کی تیسری بیٹی رحمت التبار ممیری شریک حیات ہے۔ ان کی بیٹیوں میں جیلانی بانو بڑی ہیں۔ ہاشم معز الدین کو ایک لڑکا ہے صابر محی الدین، اور پانچ لڑکیاں ذکیہ سلطانہ، نصرت سلطانہ، عشرت سلطانہ، مسرت سلطانہ اور حسرت سلطانہ ہیں۔ نصرت سلطانہ میرے دوسرے لڑکے سراج الدین سلیم کی اہلیہ ہے۔ میرے پھوپھی زاد بھائی الحاج محمد عبد الشکور اپنے تمام بھائیوں میں اس لئے بھی زیادہ خوش نصیب ہیں کہ انہیں آٹھ بیٹے اور ایک بیٹی قیصر سلطانہ ہے جو ڈاکٹر نسیا ز شیخ سے بیاہی گئی جو گلبرگہ میں ایک نامور ڈاکٹر کی حیثیت سے شہرت رکھتے ہیں۔ اعظم محی الدین، عید الحمید اور مخدوم محی الدین تجارت پیشہ ہیں۔ ہمناباد میں رہتے ہیں۔ اعظم محی الدین کی شادی منا اکیلی (ظہیر آباد) کے گھڑا و پٹیل کی لڑکی طیبہ بیگم سے ہوئی۔ اعظم محی الدین کے پانچ بیٹے معظم محی الدین، کاظم محی الدین، ناظم محی الدین، مکرم محی الدین اور خرم محی الدین اور سات بیٹیاں، ریحانہ، فرزانه، رضوانہ، دردانہ، فرحانہ، شبانہ اور عرفانہ ہیں۔

عید الحمید کی شادی تانڈور کے ایک سجادہ خاندان کے عبد القیوم صاحب کی لڑکی زلیخا بیگم سے ہوئی، جنہیں ایک بیٹا زبیر محی الدین اور تین بیٹیاں بشریٰ بتول، اسریٰ بتول، اور حمیرہ بتول ہوئیں۔ مخدوم محی الدین کی شادی عبد الرحمن منشی کی لڑکی انیس فاطمہ سے ہوئی، جنہیں تین بیٹے ارشد محی الدین، عدنان اور عرفان ہیں اور ایک بیٹی سُمرن ہے

ہے، ڈاکٹر محمد اکرام علیہ الرحمہ محکمہ تعمیراتِ انجمن میں، پیشہ طبابت سے بھی تعلق رکھتے ہیں۔

ان کی اہلیہ سیدہ سفیہ نسرتین، جناب سید حسین کی صاحبزادی ہیں، انہیں پانچ بیٹیاں، رخصانہ انجم، آمنہ نسرتین، عائشہ فاطمہ، عطیہ تبسم، مبعوضہ فاطمہ اور ایک لڑکا محمد مصطفیٰ ہے۔

ڈاکٹر لطیف، عبدالشکور صاحب کا ایک قیسملہ پرور بیٹا ہے۔ وہ اپنے

بھائیوں، والدین، رشتہ داروں کی کھل کر رحمی مدد کرتا ہے۔ یہ سلسلہ اب بھی جاری

ہے۔ اس نیکی میں ان کی بیوی قمر سلطانہ ہم خیال ہے۔ ڈاکٹر لطیف جب اعلیٰ تعلیم

کے لئے ہمناباد سے حیدرآباد آئے تو میرے ہاں مقیم رہے، انہیں شدت سے

اس بات کا احساس ہے کہ ان کی تایا زاد بہن (میری اہلیہ) نے حیدرآباد میں ان کی

طالب علمی کے زمانے میں بہت زیادہ خدمت کی ہے۔ جب بھی وہ امریکہ سے حیدرآباد

آتے ہیں تو بہن کے لئے ایک خصوصی تحفہ ضرور لے آتے ہیں۔ ڈاکٹر لطیف تقریباً

۱۸ سال سے نیوجرسی (امریکہ) میں مقیم ہیں، جہاں ایک تھیل ترین ممتاز ڈاکٹر کی

حیثیت سے شہرت کے حامل ہیں۔ ان کے دو لڑکے ڈاکٹر محمد فاروق اور اسلم ہیں،

لڑکی کا نام نکھت بانو ہے۔ ڈاکٹر لطیف ان برسوں میں صرف ہم مرتبہ ہندوستان

آئے۔ پہلی دفعہ اپنی بہن قیصر سلطانہ کی شادی کے موقع پر دوسری دفعہ ڈاکٹر رفیع

مئی شادی کے موقع پر تیسری دفعہ اپنی والدہ کی علالت کی خبر سن کر، اور چوتھی دفعہ

اپنی والدہ کے انتقال کے موقع پر جب کہ وہ قریب مرگ تھیں۔ ان کے ایک اور

بھائی ڈاکٹر خواجہ معین الدین بھی نیوجرسی (امریکہ) میں مقیم ہیں۔ انہیں قلبی کاموں

سے دلچسپی ہے۔ ان کی بیوی قیمہ مشہور عثمانیہ پروفیسر عاتق علی خان کی لڑکی

ہے۔ ان کے دو لڑکے عمران اور اعتماد ہیں۔ ڈاکٹر محمد شفیع، گلبرگ میں مشہور و معروف

ڈاکٹر کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں۔ ان کی بیوی ڈاکٹر شمیمہ بانو مولوی عبد الرحمن
 حاد کی بیٹی ہے۔ ڈاکٹر شیخ کو دو لڑکیاں سربیدہ اور رفیدہ ہیں۔ عبد الشکور صاحب
 کے بڑے لڑکے احمد علی الدین کا دو سال قبل بھارہ قلب انتقال ہو گیا، وہ
 ایک تاجر تھے۔ ان کی بیوی نجم النساء مولوی عبدالکریم عینی صدر مدرس مدرسہ
 یادگیر کی لڑکی ہے۔ ان کے چھ لڑکے حامد علی الدین، عابد علی الدین، قادر علی الدین،
 خالد علی الدین، شاہد علی الدین اور ارشد علی الدین اور پانچ لڑکیاں کلیم بیگم،
 نسیم بیگم، وسیم بیگم، قدیم بیگم، شمیم بیگم ہیں۔ عبد الشکور صاحب کا ایک
 لڑکا فیض الدین ۲۰، ۲۲ سال کی عمر میں لاری کے ایک حادثہ کا شکار ہو گیا۔
 ماموں الحاج عبدالحق صاحب (ڈپٹی میئر) ایک اصول پسند، سنجیدہ طبیعت اور
 مخفی انسان کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں۔ زندگی کے طویل سفر میں ممکن نام
 کی کوئی چیز انہیں یاد نہیں ہے۔ آج بھی وہ جواہر ٹاکسیز ہمناباد میں منیجر کی
 حیثیت سے کام کر رہے ہیں۔ جواہر ٹاکسیز بہار سے خاتون کے کچھ افراد اور کچھ
 دیگر اصحاب کی مشترکہ ملکیت ہے جس میں ہمارا بھی تھوڑا سا حصہ ہے۔

میرے والد کا سلوک میری تینوں والدہ کے ساتھ نہایت منصفانہ رہتا
 تھا۔ گھر میں ایک ہی چولہا جلتا تھا۔ میں نے اوائل عمر میں ابتدائی اور دینی
 تعلیم اپنے تایا حیدر علی سے حاصل کی، جو علامہ شیخ پورہ کی مسجد میں نماز فجر
 کے بعد بچوں کو تعلیم دیتے تھے۔ میرا پہلا دینی مدرسہ وہی مسجد ہے۔ اس
 وقت کے میرے دوستوں میں محمد علی اور عبدالکریم معشوق قابل ذکر ہیں۔ (افسوس
 ہے کہ ان دونوں کا انتقال ہو چکا ہے)۔ میرے بچپن کے اچھے دوستوں میں

عبد السليم صاحب کو ان دنوں فالج ہو گیا تھا اس کے باوجود وہ بائیں ہاتھ میں بید کی لکڑی پکڑ کر طلباء کو سزا دیتے تھے۔ فالج کی وجہ سے وہ ایک بیل کی بندھی میں بیٹھ کر اسکول آتے تھے اور بندھی میں بیٹھ کر ہی شام کے وقت فٹ بال گراؤنڈ (بس ڈپو کے قریب) پہنچ جاتے اور طلباء کا کھیل دیکھا کرتے تھے۔ ان دنوں فٹ بال کھیلنے کا ہر اسکول میں کچھ زیادہ ہی رواج تھا۔ ان کے انتقال کے بعد اسکول کے ایک سینئر اور قابل ترین استاد جناب بنی الحسن فاضل دیوبند، صدر مدرس بنوئے جو مظفر نگر (یوپی) کے رہنے والے تھے۔ جس استاد نے مجھے اسکول کی طالب علمی کے زمانے میں زیادہ متاثر کیا وہ بنی الحسن صاحب تھے۔ بنی الحسن صاحب اپنے تمام شاگردوں میں مجھے زیادہ عزیز رکھتے تھے۔ وہ اسکول کی دیوار سے متصل ایک مکان میں رہتے تھے۔ جہاں شام میں ان کے خاص شاگرد ان سے فارسی پڑھتے تھے جن میں سے ایک میں بھی تھا۔ جب میں ہفتم جماعت کا طالب علم تھا تو فارسی زبان میں گفتگو کرتا اور فارسی میں مضامین لکھتا تھا۔ بنی الحسن صاحب کو شکار کا بہت شوق تھا۔ شام میں اکثر نالے پر چلے جلتے اور ایک دو کبوتر کا شکار کرتے۔ میں اکثر ان کے ساتھ رہتا۔ ان کے خاص دوستوں میں ہمناباد کے مستقیم پولیس نظام الدین صاحب بھی تھے جو ان سے ملنے کے لئے کبھی کبھی ان کے گھر آجاتے (وہ بھی یوپی کے تھے)۔ میرے اسکول کے اساتذہ میں قاسم علی صاحب، سید صاحب، عبدالرشید، علیم الدین، رگھوناتھ، کشن راؤ، محمد اسماعیل، عبدالحبار اور اسکول کے ساتھیوں میں شہاب الدین، رشید میاں، نور رشید خان، عبدالحق، عبدالغفور، گویند پتا اور ویر کیشیا، انگریزی یڈ وکیٹ قابل ذکر ہیں۔ چونکہ ہمناباد

بادشاہوں اور راجاؤں کی کہانیاں سناتی تھیں۔ مجھے کالی چکنی میٹھی سے کھائے
بیل، گھوڑا، ہاتھی کے علاوہ جوار کے دھنسل کی کھڑیاں بنانا سکھاتی تھیں۔ مجھے
پتنگ، بنانے، اڑانے، کاٹنے اور لوٹنے کا بہت شوق تھا۔

میرے سرپرستوں کی یہ خواہش تھی کہ میں مرہٹی لکھنا پڑھنا سیکھوں،
کیونکہ ہمارے کپڑے کی دوکان کے کھاتے مرہٹی میں لکھے جاتے تھے۔ چنانچہ مجھے
ایک ہندو ماسٹر کے گھر پر اور ایک دیول نگریش ور میں پڑھنے کے لئے جاتا تھا۔
ہماری دوکان میں ایک ہندو منیم — تھا جو کھاتے لکھتا تھا۔ ہر سال دیوالی کے
موقع پر آمدنی و خرچ کا حساب ہوتا۔ والد صاحب کے انتقال کے بعد بہنوں

عبدالحق صاحب نے کاروبار سنبھال لیا۔ ہم نے ذاتی طور پر کبھی زراعت نہیں کی
بلکہ شروع ہی سے زمین قول پر دے رکھی تھی۔ پسیدہ دار کا نصف حصہ ہم کو ملتا تھا۔
جب فصل تیار ہو جاتی تو قول دار نصف اناج لے لیتا اور نصف اناج ہمارے گھر
پر ہوتا دیتا (یہ اس کی ذمہ داری میں شامل تھا)۔ ہمارے کھیتوں میں زیادہ تر
جولہ کی فصل اگائی جاتی تھی۔ اُس زمانے کا ایک رواج یہ بھی تھا کہ جس کھیت میں
اچھی فصل ہوتی تو اس سے پہلے وہاں کے ایک بزرگ حضرت سید شاہ حسینیؒ کی
زیارت کی جاتی، جن کا مزار کھیتوں سے ذرا دور آبی کوڑے کے پہاڑ پر واقع ہے۔
بعض کسان اہل زمین دار اچھی فصل ہوتے پر بکرے کی نیاز کرتے اور اپنے قریبی
لوگوں کو کھیت پر دعوت دیتے۔ جب کھیت میں جوار کی راس ہوتی ہے تو بڑا
لطف آتا ہے۔ رات رات بھر جاگ کر بیلوں کے ذریعہ جوار کے بھٹوں کو کھنڈ لویا
جاتا ہے اور یہ عمل دو تین دن تک جاری رہتا ہے۔ ہر کھیت سے بیس تھیلوں سے

لے کر چالیس تھیلوں تک جوار نکلتی تھی۔ جوار کو غلہ کر کے کھلیاں پر ہی اناج کے دو حصے کئے جاتے ہیں۔ ایک حصہ کسان لے جاتا، دوسرا حصہ کھیتوں کا مالک یعنی زمیندار۔ سال بھر اپنے کھیتوں کی جوار استعمال کی جاتی ہے۔ اگر ضرورت سے نائد، تو بیج دیا جاتی ہے، جوار کی کڑبی یا تو کھلیاں پر ہی فروخت کی جاتی ہے یا کھیت کے سا ایک گڈے میں ڈھیر کی شکل میں رکھی جاتی ہے اور اس کو دھوپ یا بارش سے چمانے کے لئے مٹی کے ڈھیلوں سے ڈھانپ دیا جاتا ہے۔ یہ کڑبی گلے، بھنس، بیلوں کے کھانے کے کام آتی ہے۔ گائے یا بھنس جیدیم جنتی ہے تو تین، چار دن تک اس کا دودھ بڑوسیوں اور رشتہ داروں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ یہ دودھ بہت گاڑھا ہوتا ہے۔ اس دودھ میں گڑ ڈال کر گرم کیا جاتا ہے۔ اس طرح وہ دودھ بیوسی میں بولی جاتا ہے۔ بیوسی بڑی لذیذ اور طاقت ور ہوتی ہے۔

پولیس ایکشن کے بعد جب یہ معلوم ہوا کہ بعض قولدار، قول پیرلی ہوئی زمینوں پر قبضہ کرنے لگے ہیں تو ہمارے گھر والوں بھی قول دار سے جو کئی برسوں سے قول پر ہماری زمین پر کاشت کرتا تھا، زمین واپس لے لی اور میرے حکمنا زاد بھائی امیر الدین کے حوالے کی۔ انہوں نے کافی محنت کی اور اچھی فصل اگائی۔ ان کے انتقال کے بعد ہم نے اپنی زمین اپنے ایک دوسرے رشتہ دار محمد حنیف کو قول پر دے دی جو اپنی زمینات کے ساتھ ہماری زمین پر بھی کاشت کرتے ہیں۔

ایک روز میں اپنے دوستوں کے ساتھ کبڈی کھیل رہا تھا تو کسی نے مجھ سے کہا کہ محلہ نور خاں والے حملہ کی غرض سے ہمارے محلہ کی طرف آرہے ہیں۔ یہ سُننا تھا کہ میں فوراً جوش میں آگیا اور فوراً اپنے گھر کے ایک کمرہ کے کونے میں رکھی ہوئی بندوق اٹھالی اور اُس طرف بھاگنے لگا جہاں سارے محلہ کے لوگ جمع ہو گئے تھے۔ میری والدہ نے مجھے بہت روکا لیکن میں مشتعل ہو گیا تھا، رُک نہ سکا۔ میں بھاگت ہوا محلہ بھی واقع (کمان) دروازہ تک پہنچ گیا۔ وہاں میں نے دیکھا کہ محلے کے بہت سے چھوٹے بڑے لوگ مختلف قسم کے ہتھیار لئے کھڑے ہوئے ہیں۔ ہمارے محلہ کے گروہ کی قیادت محمد صدیق قمر الدین کے علاوہ عبدالقادر (میرے تایا زاد بھائی) کر رہے تھے۔ صدیق صاحب نے میرے جوش و ولولہ کو دیکھا تو کہا کہ میرے پاس کھڑے رہو، جب میں کہوں گولی چلا دینا، ڈرنا نہیں۔ لیکن اُس وقت کوئی جھگڑا نہیں ہوا۔ اُس محلہ کے لوگوں نے اِدھر کا رخ نہیں کیا۔ میں نے جب جوش میں آکر بندوق اٹھائی تو مجھے اس بات کا بھی اندازہ نہیں تھا کہ اس بھرمار بندوق میں پھرے ہیں کہ گولی ہے یا خالی ہے۔ ویسے بھی مجھے بندوق چلانا نہیں آتا تھا۔ بس ایک اندازہ قائم کر رکھا تھا۔ آج میں اپنی اُس حرکت کے بارے میں غور کرتا ہوں، تو سوچتا ہوں کہ بچپن میں انسان کن کن صلاحت کا شکار ہو جاتا ہے۔



پرنندوں کا شکار

مجھے بچپن میں غلیس سے کبوتر، تیتھر، بیٹر اور مختلف اقسام کے پرنندوں کو مارنے کا شوق تھا۔ میں اپنے دوستوں کے ساتھ جنگل میں چلا جاتا اور جہاں کہیں کوئی پرنندہ دکھائی دیتا، اپنی غلیس کا نشانہ بناتا تھا۔ ایک دن میں نے ایک مرسے ہوئے پرنندہ کو درخت کی ایک ٹہنی پر باندھ دیا اور اس کو نشانہ بناتا رہا۔ دھشتا میرے دل میں خیال پیدا ہوا کہ ایک پرنندہ کی بھی تو جان ہوگی ہے انسانوں کی طرح، اور پھر مرسے ہوئے پرنندوں پر نشانہ لگانا تو اور بھی انسانیت سے حرکت ہے۔ یہ خیال جب افیت رساں بن گیا تو میں نے غلیس پھینک دی اور پھر میں نے کبھی کسی پرنندہ کا شکار نہیں کیا۔ میرا دل کچھ اس قدر گداز ہے کہ میں کسی بھی جاندار کو جب مرتا ہوا دیکھتا ہوں تو میرا دل کانپ کانپ جاتا ہے۔



ندیوں اور باولیوں میں تیرنا

مجھے بچپن میں نندیوں اور باولیوں میں تیرنے کا بہت شوق تھا۔ خاص طور پر موسم گرما میں، میں اپنے ساتھیوں کے ساتھ اونچی اونچی باولیوں میں

خود کر نہ لیا کرتا تھا۔ محلہ شیوپور کے کنارے میرے تایا کا ملا (تدی) کے کھیت تھا۔ اُس ملے میں ایک بڑی باؤلی تھی جس میں ہمیشہ پانی بھرا ہوا رہتا تھا۔ میں اکثر اس باؤلی میں تیرتا تھا۔ بہت اونچائی سے ایک خاص طریقہ سے کودنے پر باؤلی کا پانی اُچھل کر باؤلی کے اوپر آجاتا تھا جس کی وجہ سے باؤلی کے آس پاس بیٹھے ہوئے لوگوں پر پانی گرتا تھا۔ خوب پانی نہانے کے بعد میں اپنے تایا کے کھیت سے پیاز کے پودے اُکھاڑ کر لاتا۔ موٹ کے پانی سے دھو دیتا، پیاز کو پودے سے الگ کر دیتا اور پیاز پر زور سے ٹکا مار کر چھوڑ دیتا جس میں سے تلخ پانی نکل جاتا تھا اور میں جوار کی روٹی سے پیاز کھاتا تھا، جو بے حد مزہ دے جاتی تھی۔



بھیس بدلنا

عام لڑکوں کی طرح میں بھی بچپن میں بہت شریر تھا۔ ایک دن مجھے اور میرے دوستوں (علیم الدین، عبدالرحمن اور عبدالخالق) کو یہ شرارت سوچھی کہ کیوں نہ اپنے محلہ میں شام ڈھلتے ہی بھیس بدل کر بھیک مانگیں۔ اُس زمانے میں بھیک مانگنے کا مطلب یہ تھا کہ روٹی مانگی جائے اس لئے کہ غرا، صبح و شام روٹی مانگتے تھے اور بعض گھروں سے روٹی کے لئے آٹا لے جاتے تھے۔ ہم نے جسم پر راکھ مل لی، چہرہ پر راکھ اور مصنوعی دھڑکی، تہہ بے تہہ صاف

ہاتھ میں کٹورا لیا اور بغل میں ایک جھولی ڈالی۔ بالکل گداگروں کی طرح ہم نے بھیس بدلانا۔ سب سے پہلے اپنے گھر سے متصل جناب غلام بنی (ہمارے چچا صاحب) کے مکان پر میں نے آواز دی۔ ”اماں فقیر کو روٹی ڈالو۔“ میری چچی آواز سن کر دروازہ پر آئیں اور میری جھولی میں روٹی ڈال دی۔ دوسرا مکان میرے رشتہ کے ایک ماموں غلام رسول صاحب کا تھا، اس طرح میں نے کچھ اور گھر جا کر روٹیاں جمع کر لیں۔ صبح ہم نے یہ روٹیاں فقیروں اور غریبوں میں تقسیم کر دیں۔



پتھروں کی بارش

میرے محلہ کے چند لڑکوں کو ایک انوکھی شرارت سوچھی۔ کچھ لڑکوں نے کدھی رات کے بعد محلہ کے گھروں پر پتھر بوسانا شروع کیا۔ محلے والے پریشان ہو گئے، ایسا واقعہ کبھی نہیں ہوا تھا۔ یہ سب کچھ کیا ہو رہا ہے۔ محلے والوں کو تجسس ہوا کہ آخر اس امر کا پتہ چلایا جائے کہ یہ شرارت کس کی ہے۔ ایک شب محلے کے کچھ لوگوں نے ایک گروپ بنایا اور یہ طے کیا کہ ساری رات جاگتے رہیں اور یہ پتہ لگائیں کہ پتھر کہاں سے آرہے ہیں؟ ایک گروہ محلے کے ہر گھر میں جا کر یہ جاننا چاہا کہ کوئی لڑکا گھر سے غائب تو نہیں ہے۔ ایک رات وہ شرارتی لڑکے پکڑے گئے (جن میں میں نہیں تھا)

انہیں صبح نماز فجر کے بعد محلہ کی مسجد میں پیش کیا گیا اور انہیں سزا دی گئی۔
 ہمارے محلہ کا ایک رواج تھا کہ کوئی خاص مسئلہ ہو تو محلہ کی مسجد میں فجر
 کی نماز کے بعد اس خاص مسئلہ کے بارے میں غور کیا جاتا اور اس کی یکسوئی
 کی جاتی تھی۔



جے۔ رام جی کی مٹھائی

ہمنا باد کے بازار میں ایک مٹھائی فروش جے رام جی کی دوکان خوب
 چلتی تھی۔ خاص طور پر اس کی دوکان میں گلاب جامن، نہایت لذیذ ہوتے تھے۔
 کبھی کبھی ہم چند دوست تقریباً ۹ بجے شب مٹھائی کھانے کے لئے جے رام جی
 کی دوکان جاتے۔ دوکان میں بیٹھ کر گلاب جامن کھا لیتے۔ گلاب جامن، کھا
 کے بعد کھارا (چوڑا منگواتے)۔ جے رام جی رات کو بھنگ کھایا کرتے تھے۔
 وہ دوکان کے کاروبار بھنگ کے نشہ ہی میں چلاتے تھے۔ نشہ میں انہیں یاد
 نہیں رہتا تھا کہ کس گاہک نے کیا کیا کھایا ہے۔ جب ہم مٹھائی کھانے
 کے بعد اٹھتے تو جے رام جی سے پوچھتے کہ "جے رام جی کتنے پیسے ہوئے؟"
 وہ فوراً جواب دیتے۔ اُتے ہی۔ جب ہم دوبارہ پوچھتے کتنے؟ تو کہتے
 کہ اُتے ہی اور وہ صرف کھارے (چوڑے) کا حساب کر کے دے دیتے
 انہیں نشہ میں صرف آخری ٹیٹم یاد رہتا تھا۔ پتہ نہیں جے رام جی کو کتنے

لوگوں نے کس کس انداز سے دھوکہ دیا ہوگا۔ کبھی کبھی نیچین کی ایسی حرکتوں کے بارے میں سوچتا ہوں تو بڑی حماقت ہوتی ہے۔



ہمناباد کا محرم

میرے بچپن میں ہمناباد کا محرم بڑی سرگرمی کی نیلک ساتھ گزرتا تھا۔ چالیس محرم سے ۱۲ ویں محرم تک کافی مصروفیات رہتی تھیں۔ میں اپنے دوستوں کے ساتھ ہر رات مختلف محلوں میں علم دیکھنے کے لئے چلا جاتا تھا۔ ہمناباد میں تین علم کی سواریاں بڑی دھوم دھام سے نکالی جاتی تھیں۔ محلہ ڈیرہ پٹ سے محرم کو حضرت امام قاسم اور گوگی صاحب کے علم اٹھائے جاتے تھے۔ یہ علم نواب ہندہ علی خاں جاگیردار کی نگرانی میں اٹھائے جاتے اور انہیں کے اخراجات سے علم کی سواری کا انتظام کیا جاتا تھا۔ رات کے تقریباً ڈھائی بجے یہ علم نکلتے اور صبح صبح واپس ہوتے اور ٹھنڈے کئے جاتے۔ محرم کے اس جلوس میں بیکڑیل ہندو مسلمان نہایت عقیدت کے ساتھ شریک ہوتے تھے۔ یہ علم ہمناباد کے سب سے زیادہ مشہور علم ہیں جن کی سواریاں عقیدت و احترام کے ساتھ نکالی جاتی تھیں۔ جہاں سے یہ علم گزرتے ان راستوں پر مکانات اور دوکانوں میں لوگوں کی ایک کثیر تعداد ان کے دیکھنے کے لئے موجود رہتی تھی۔ (مرد، عورتیں، بچے، جوان، بوڑھے سبھی شریک ہوتے تھے)۔ ہمارے محلہ کفر توڑ سے بھی ایک

علم فصل صاحب ۱۰ ار محرم کی صبح ۱۰ بجے نکلتے ہیں۔ سینکڑوں افراد بلا تخصیص
 تھوب، ذات و فرقہ، سواری دیکھنے جوق در جوق آجاتے تھے۔ اسی وقت لوگ ایک عظیم
 تھانے میں ٹہرتے، جب علم پکڑنے والے شخص کو درجہ آجاتا۔ وہ مخصوص شخص علم
 اٹھانے سے ایک گھنٹہ پہلے آجاتا تھا اور لوگوں میں کافی فاصلے پر بیٹھا رہتا۔
 جب علم اٹھانے کا وقت قریب آجاتا تو وہ اچانک کھڑا ہو کر بغیر ٹپک بھسکائے
 علم کو گھومنے لگتا۔ تمام لوگ اس کی طرف متوجہ ہو جاتے، علم اور اس کے درمیان
 راستہ بناتے۔ رفتہ رفتہ اس کے جسم میں رعشہ کی سی کیفیت پیدا ہو جاتی تھی
 اور وہ بھاگتا ہوا علم پر گر جاتا۔ اس کے ساتھ ہی ہلکیاں، ٹاشے، توبت، نقار
 بجنا شروع ہو جاتے۔ مجاور، علم اُس کے حوالے کر دیتا۔ علم کی سواری مقررہ
 راستوں سے گذرتی۔ ایک اور علم کی سواری محرم کی ۱۲ ویں تاریخ کو محلہ شیوپور
 سے نکلتی تھی۔

محرم کی تیاریاں بقرعید کے بعد ہی سے شروع ہو جاتی تھیں۔ چھوٹی عمر
 کے بعض لڑکوں کو شیر پھر بنایا جاتا تھا۔ منکھم نکالے جاتے، پہلوان اپنے فن
 کا مظاہرہ کرتے۔ سولہ کے سامنے لکڑیوں اور تلواروں کی کریمہ بازی کا
 مظاہرہ ہوتا۔ ہر محلہ کے لوگ اپنی اپنی پارٹی کے ساتھ ایک گروپ کی شکل میں
 شریک ہوتے تھے۔

محرم میں بہت ہی دل سوز اور غمگین دھنوں میں عورتیں ماتم کرتی تھیں۔
 بعد اگھر جس کی شکل ایک بارہا کی سی ہے کھکھلے آنگن میں محلہ کی خواتین حلقہ
 بنا کر رات رات بھر ماتم کرتی ہوئیں شہیدوں کا تذکرہ کرتی تھیں۔ یہ سلسلہ

رات کے ۱۰ بجے کے بعد شروع ہوتا اور صبح تک جاری رہتا۔



درگاہیں، زیارتیں اور نیازیں

اُس زمانے میں بزرگانِ دین کی درگاہوں پر جانا، ان کی زیارت کرنا اور ان سے منشیں مانگنے کا عوام رواج تھا۔ ہننا آباد سے قریب کوئی چھ میل کے فاصلے پر ایک گاؤں گھوڑواڑی شریف کے نام سے مشہور ہے۔ جہاں کے بزرگ حضرت اسماعیل شاہ قادری کی بڑی شہرت ہے۔ وہاں اب بھی ہر جمعرات کو سینکڑوں بکرے نیاز کے سلسلے میں ذبح کئے جاتے ہیں۔ مجھے بچپن میں صرف دو دفعہ گھوڑواڑی شریف جاتے کا موقع ملا۔ روایت کے مطابق زیارت کیلئے درگاہ پر اُس وقت جاسکتے ہیں جب کہ زائرین درگاہ سے متصل تالاب میں نہانے سے فارغ ہو جائیں۔ زائرین کا عقیدہ ہے کہ اُس تالاب کے پانی سے بچوان کیا جائے اور اگر ایسا نہیں کیا گیا تو بچوان میں سے کپڑے نکلے ہیں۔



ہمناباد کی جاترائیں

ہمناباد کی شہری ویر بھڑا لٹھور مانک نگر کے مانک پر بھو کی جاترائیں کافی مشہور ہیں، جن میں ہزاروں ہندو مسلمان شریک رہا کرتے ہیں۔ مانک پر بھو کی جاترا مانک نگر میں ہوتی ہے جو ہمناباد سے بمشکل دو کیلومیٹر پر واقع ہے۔ میں اپنے دوستوں کے ساتھ ہمت آباد کی جاترا اور مانک نگر کی جاترا دیکھنے گئے۔ ہر سال پابندی سے جاتا تھا۔ شام میں دوکانوں اور میلوں میں گھومنے کے علاوہ میں رات بھر مندر میں بچن سنا کرتا تھا۔ اُس زمانے میں دور دور سے مشہور گیلے آتے تھے۔ ہندو مسلم نمائندہ شخصیتوں کے لئے فرش پر نشستوں کا انتظام کیا جاتا تھا۔ جاتراؤں میں ہندو مسلم سبھی شریک ہوتے تھے۔ یہ جاترائیں گنگا جمنی اور ایک تہذیبی جشن کا منظر پیش کرتی تھیں۔ مندر کا بچہ دی ہمیں بھی تاریل کے ٹکڑے کھانے کے لئے دیتا تھا اور ہم بڑے شوق سے تاریل کھاتے تھے۔ ان جاتراؤں میں ہر قسم کے سامان کی دوکانیں لگتی تھیں، کچھ ضروری چیزیں ہم بھی خریدتے تھے۔ ہمناباد کی جاترا میں مسالے کے لٹو خصوصیت کے ساتھ فروخت ہوتے تھے جو تہایت لذیذ ہوتے ہیں۔ جاتراؤں میں جب رتھر نکالا جاتا ہے تو وہ منظر دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ عقیدت مند ہندو رات بھر جاگ کر رتھر میں شریک ہوتے ہیں۔ مسلمان بھی رتھر کے جلوس میں شریک ہوتے ہیں۔

پولیس ایکشن

۱۴ ستمبر ۱۹۴۸ء کو جب ریاست حیدرآباد کی پولیس ایکشن ہوا تو میں اُس وقت حیدرآباد میں تھا۔ جس دن حضور نظام نواب میر عثمان علی خاں کی فوج نے ہتھیار ڈال دیئے تھے اُس وقت حیدرآباد میں ہر طرف بے حد سراپا مچ چکی ہوئی تھی۔ جو لوگ ہمنامہ باداؤد اُس پاس کے علاقوں سے حیدرآباد آئے ہوئے تھے وہ بہت زیادہ پریشان تھے۔ اُس وقت ہم تک یہ خبریں پہنچ چکی تھیں کہ ملٹری، عثمان آباد کو روندتے ہوئے ہمنامہ باد کو تباہ کر چکی ہے اور سرگرمی کے اُس پاس جو بھی گاؤں ہیں وہاں قتل و غارت، لوٹ مار کا بازار گرم ہو رہا ہے۔ یہ بھی اطلاع ملی تھی کہ ہمارے خاندان کا ایک شخص بھی زندہ نہیں بچا۔ ایک ہفتہ کے بعد میرے ماموں عبداللہ صاحب کا ایک ہندو فیم اُنہیں ہمنامہ باد لے جانے کے لئے آیا، اُس نے اطلاع دی کہ ہمنامہ باد میں سب کچھ ٹھیک ہے۔ اُسے اور ہندوؤں نے مسلمانوں کی حفاظت کی ہے۔ پولیس ایکشن کے بعد جب راستے صاف ہو گئے ہندو امن قائم ہو گیا تو میں ہمنامہ باد گیا۔ ہمنامہ باد میں داخل ہونے کے بعد معلوم ہوا کہ فوج نے ہر گھر کی تلاشی لی۔ جہاں بھی ہتھیار ملے لے لئے۔ ہمارے محلے میں بھی ہتھیاروں کے ضبط کرنے کے سلسلے میں فضا تلاشی ہوئی۔ خدا کا شکر ہے کہ ہمنامہ باد کے دو تاجر شری رام چندر کھتری اور مسٹر راجپال اپنی فوج کے ساتھ تھے جن کی وجہ سے نہ تو کوئی جانی

نقصان ہوا اور نہ مال و اسباب لوٹا گیا۔ میری والدہ نے مجھے بتایا کہ جب ملٹری ہمارے گھر ہتھیاروں کی تلاش کیلئے آئی تو اسے کوئی ہتھیار نہیں ملا۔ نگو ہمارے گھر میں کسی قسم کا بھی ہتھیار نہیں تھا) البتہ فوجیوں نے تجوری توڑنے کی سرکشی کی مگر وہ تجوری توڑنے کے (ویسے بھی تجوری میں کچھ فوری نہ تھا) کے سوا کوئی اور شے نہ تھی) بھاگتے ہوئے فوجی دیواری گھری اور قہقہے لے گئے۔ والد نے یہ بھی بتایا کہ پولیس انکشن کے دوران ہمارے گھر میں خطرناک گولی مارا گیا تھا اور خطرناک خال اکھاڑہ کے تقریباً ۵۰، ۶۰ مرد خواتین اندر تکے ایک ہفتہ تک ٹھہرے ہوئے تھے۔ جب حالات بہتر ہو گئے تو وہ لوگ اپنے اپنے گھروں کو واپس ہوئے۔ پولیس انکشن کے دوران میری ایک رشتہ کی بھوپھی وزیر بی صاحبہ گجرا کہ ۴۰ گز گہری باؤلی میں کود گئی تھیں لیکن خدا کے فضل و کرم سے وہ بچ گئیں ان ہی دنوں میرے چھوٹے بھائی محمد ضیاء اللہ کو شہر پسند اور ملٹری کے جوان یہ کہہ کر گھر سے لے گئے کہ یہ رضا ہے لیکن میرے چچا غلام نبی جبرأت و حوصلہ سے کام لیتے ہوئے اُس کو چھڑا دیا یہ کہتے ہوئے کہ یہ ایک طالب علم ہے۔ اس ہنگامے کے دوران میرے گھر رشتہ دار گھر آکر ہینا آباد سے حیدر آباد جانے کے لئے اپنے اپنے گھروں سے نکل گئے تھے۔ راستے میں ایک گاؤں بھرتی میں ٹھہر گئے۔ اس وقت یہ بات عام تھی کہ اس پاس کے شہر پسند مسلمانوں پر حملہ کر رہے ہیں امدان کے گھروں کو نوٹ رہے تھے۔ جس مقام پر میرے بھانجے مشہور شاعر علی الدین نوید کے والد، والدہ اور خندان کے دیگر افراد ٹھہرے ہوئے تھے اُس مکان کو غنڈوں

نے گھیر لیا اور مکان میں گھس کر علی الدین نوید کے والد محمد ریاض الدین کو مارا۔ ان کے دو چچا، فیاض الدین (جانی) اور شجاع الدین، میرے ایک اور بھانجہ تحصیل تنویر کے والد محمد قاسم کو قتل کر دیا۔ پولیس کچن میں ہمارے رشتہ دہوں کا یہ سب سے بڑا المیہ ہے۔ اگر یہ لوگ ہینا باد میں رہتے تو انہیں ان کے ساتھ یہ حادثہ پیش نہ آتا۔

شریف الخس انسان تھے۔ ان پر کوئی بھی شر پسند حملہ نہیں کر سکتا تھا۔ میں ہینا باد میں، ہفتم جماعت کی تعلیم ختم کرنے کے بعد مزید تعلیم سکھانے میرا ارادہ تھا۔ میری والدہ نہیں چاہتی تھیں کہ میں مزید تعلیم حاصل کروں۔ والدہ کی یہ خواہش تھی کہ میں اپنے والد کی تجارت کو سنبھال لوں۔ اس زمانے میں ہینا باد کے طالب علم ہفتم جماعت کی تعلیم ختم کرنے کے بعد اعلیٰ تعلیم کے لئے حیدرآباد آتے تھے (جو کہ ہینا باد میں صرف مڈل اسکول تھا)۔ والدہ کے ارادہ پر ختم کامیاب کرنے کے بعد بھی میں ایک سال ہینا باد میں ہی رہا۔ اس اثنا میں میں نے ہینا باد کے ایک تعلیمی ادارہ میں منشی کی تعلیم حاصل کی۔ منشی کی سند اس زمانے میں میرٹک کے معاشی تھی۔ میں نے اچھے خبرات کے ساتھ منشی کا امتحان کامیاب کیا۔ منشی کامیاب کرنے کے بعد حیدرآباد کی طرف میری نظریں آٹھنے لگیں۔

مجھے حیدرآباد آنے کی ترغیب دینے میں میرے ایک قریبی رشتہ دار عبدالرشید صاحب کی ششمنی دلچسپی کا بڑا دخل رہا ہے۔ وہ میرے ساتھ منشی کا امتحان کامیاب کرنے کے بعد حیدرآباد پہلے گئے تھے اور وہاں انہیں حکم سکول سپلائر

میں کلرک کی حیثیت سے ملازمت مل گئی تھی۔ انہوں نے یہ بھی کہا تھا کہ حیدر آباد میں تعلیم حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ سرکاری ملازمت بھی حاصل کی جاسکتی ہے۔ ہم سے پہلے تعلیم کی غرض سے حیدر آباد آنے والوں میں — محمد غوث محی الدین، عبدالواحد خاں اور عبدالمنان وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ عبدالمنان صاحب نے بولیس انکشن کے بعد حیدر آباد آنے والے پہلے رشتہ داروں کی غیر معمولی مدد کی۔ کئی مہینوں تک ان کے رشتہ دار ان کے مکان واقع دبیر پورہ میں رہے۔ عبدالمنان صاحب میرے قریبی بر شریعتہ دار ہیں، جو اپنی اعلیٰ انسانی ہمدردی کی وجہ سے سارے خاندان میں قدر کی نگاہوں سے دیکھے جاتے ہیں۔ جناب غوث محی الدین میرے حقیقی بہنوئی اور جناب عبدالواحد خاں میرے ماموں زاد بہنوئی ہیں۔ ان دونوں نے حیدر آباد میں میری طالب علمی کے زمانے میں میرا ہر لحاظ سے خیال رکھا۔ میں ان ہی کے پاس ٹھہرا ہوا تھا۔ پہلے یہ دونوں گھانسی بازار میں ایک کرایہ کے مکان میں تنہا رہا کرتے تھے، بعد میں دونوں اپنی اپنی فیصلی کو لے آئے۔ میری بہنیں حوراں بانو اور بی جانی بانو میرے ہر قسم کے آرام کا خیال رکھتی تھیں۔ میرے بچپن میں جو لوگ اپنے دور کی پہچان بن چکے تھے ان میں شیر لکڑیاں، فقیر بیگ، پھانڈہ پاشاہ وکیل، ڈاکٹر محمد ابراہیم، محمد شفیع مسعود اگرچہ غلام رسول، عثمان علی، قمر الدین، محمد مصطفیٰ، عبدالرشید، حکیم محمد عسکری، امیر الدین، عبدالقادر، اسماعیل، محمد صدیق، قاضی بکری ہیں۔

عبدالستار صاحب کی شخصی دلچسپی سے میں بھی محکمہ سیول سپلائز میں بحیثیت کلرک ملازم ہو گیا۔ کلرکل پوسٹ کے لئے منشی یا میٹرک کامیاب

کرمفروری تھا۔ علی گڑھ میٹرک کی تعلیم کے لئے میں نے پیراڈائر
 انسٹی ٹیوٹ میں داخلہ لیا۔ اس انسٹی ٹیوٹ سے طلباء کو ہر سال امتحان کے لئے
 علی گڑھ لے جانے کا انتظام کیا جاتا تھا۔ اس وقت کے اساتذہ میں ڈاکٹر عبدالرزاق
 فاروقی سابق صدر شعبہ اردو تھے۔ یونیورسٹی، بھی تھی۔ میں نے اس انسٹی ٹیوٹ کے
 ذریعہ علی گڑھ یونیورسٹی سے ۱۹۵۳ء میں میٹرک کا امتحان درجہ دوم میں کامیاب
 کیا۔ ممتاز شاعر فیض الحسن خیالی بھی اسی گروپ میں شامل تھے جو امتحان دینے
 کے لئے علی گڑھ جا رہے تھے۔ جب میں نے علی گڑھ میٹرک امتحان کا اعدادہ
 کر لیا تو اپنے چھوٹے بھائی محمد ضیاء الدین اور اپنے رشتہ کے بھتیجے حبیب الدین
 کو بھی امتحان میں شرکت کو ترغیب دی۔ ان دونوں نے ہمدان میں میٹرک فیرنگ
 سے علی گڑھ میٹرک کی تعلیم حاصل کی اور میرے ہمراہ علی گڑھ آئے۔ ان دونوں
 نے بھی میرے ساتھ ہی کامیابی حاصل کی۔ اس اشار میں میں نے جامعہ
 نظامیہ سید آباد سے انجینیئرنگ کے ساتھ منشی قاضی کا امتحان کامیاب
 کیا۔ میں پہلے ادارہ شریعت میں زیر تعلیم رہا، جہاں میرے قابل اساتذہ میں مولانا
 حمید الدین قر اور علامہ قلمیہ الحسن تھے۔ پھر میں نے غلام احمد گنجی سے
 ادارہ اشاعت العلوم میں منشی قاضی کی تعلیم حاصل کی۔ مولانا گنجی کی سرپرستی
 نے ہم طلباء کو شعر گوئی اور شاعری کی تعلیم دی۔ اس زمانے میں طلباء کو اردو
 اور فہرسی کے اچھے اچھے اشعار یاد کرائے جاتے تھے۔ ادارہ ادبیات اردو
 سید آباد سے میں نے اردو عالم اور اردو فاضل کے امتحانات درجہ اول میں بھی
 کئے۔ اردو فاضل کی بنیاد پر جامعہ اردو علی گڑھ کا امتحان ادیب کامل بہ درجہ اول

کامیاب کیا (امتحان کا سنٹر حیدر آباد تھا)۔ میں نے ان تمام امتحانات کی تیاری اپنے طور پر کی تھی (کبھی انسٹی ٹیوٹ میں شرکت نہیں کی)۔ میٹرک کامیاب کرنے کے بعد میں نے مدعیہ پرنسپل انٹر میڈیٹ کا امتحان دیا جس کے لئے مجھے بھوپال کے علاوہ اجیر شریف بھی جانا پڑا۔



علی گڑھ میٹرک کا امتحان

علی گڑھ میٹرک کے امتحان کے سلسلے میں مجھے تقریباً ۳۳ ہفتے علی گڑھ میں رہنا پڑا۔ ہمارے انسٹی ٹیوٹ کے تقریباً ۳۵، ۳۰ طلباء انٹی گڑھ یونیورسٹی کیمپس کے بالکل قریب شمساد بلاک میں مقیم رہے۔ فیض الحسن خیال صاحب سے میری پہلی ملاقات علی گڑھ جاتے ہوئے ٹرین میں ہوئی۔ دوران سفر، فیض الحسن خیال نے مجھ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا تھا کہ دوست آئیے تعلیمی تاش کھینٹیں۔ پھر خیال نے فلمی گانے گانا شروع کئے۔ ان کے قریبی دوستوں میں نواب جنید اللہ خاں اور افسر نواب (فرزند نواب دوست محمد خاں) تھے۔ میری بھی ان دونوں سے دوستی ہو گئی۔ نواب جنید اللہ خاں کے ساتھ ایک اور طالب علم جو ہم سے بڑی عمر کا تھا، نواب جنید اللہ خاں کی سرپرستی میں امتحان دیتے گئے آیا تھا (جو ایک نامعقول اور احسان فراموش قسم کا آدمی تھا) وہ نواب جنید اللہ خاں سے سردھری کا برتاؤ کرتا تھا۔ ایک دن میں

نے اور فیض الحسن خیال نے شرارتاً اُس کو مشورہ دیا کہ اس بلڈنگ کے سامنے درخت کے نیچے سکون سے امتحان کی تیاری کی جاسکتی ہے۔ وہ تیار ہو گیا۔ جیسے ہی وہ کمرسی پر اونگھنے لگا میں نے اور خیال نے اُس کو کھڑکی سے باندھ دیا اور اُس وقت تک نہیں کھولا جب تک کہ اُس نے جنید اللہ خاں سے موصافہ نہیں مانگی۔ شمشاد بلڈنگ سے کچھ فاصلے پر کچھ ہوٹلیں تھیں جہاں عمو علی گڑھ یونیورسٹی کے ہاسٹل کے طلباء شام میں چائے پینے کے لئے آتے تھے۔ رعایت ہے کہ علی گڑھ یونیورسٹی کے طلباء اُن دنوں اُن حیدر آبادی طلباء پر چلے کستے ہیں جو امتحان دینے کے لئے علی گڑھ آتے ہیں۔ ہمارا گروپ بھی اسی ہوٹل میں چائے پینے کے لئے جاتا تھا جس ہوٹل میں علی گڑھ ہاسٹل کے طلباء بیٹھتے تھے۔ ایک شام علی گڑھ کے طلباء نے ہم حیدر آبادیوں پر چلے چست کرنا شروع کئے۔ جواباً ہم نے بھی اینٹ کا جواب پتھر سے دیا۔ ایک دفعہ بڑی طرح اُلجھنے کی نوبت آئی لیکن الجھاؤ سے پہلے مرحلہ پر ہی وہ ٹڑکے ظاہر ہو گئے۔ چونکہ ہم طلباء کی تعداد نسبتاً زیادہ تھی۔ میں، فیض الحسن خیال اور بشیر دیال اپنے گروپ کی فائنگ کرتے تھے۔ پھر اُن طلباء نے ہم سے بات کر لی۔ امتحانات کے دو میلانے دنوں میں ہمارا سارا گروپ تاج محل، آگرہ اور دلی دیکھنے کے لئے گیا تھا۔

علی گڑھ میٹرک کے امتحان کے زمانے میں بعض حیدر آبادی طلباء، طوائفین کا گانا سنتے کے لئے آبادی میں جاتے تھے۔ ایک دن کا واقعہ ہے کہ وہی طالب علم جو نواب جنید اللہ خاں کے ساتھ آیا تھا، ایک طوائف کے پای گانا

متنے کے لئے گیا، معلوم ہوا کہ اُس طوائف کی نگران کسی خاتون نے اُس کے
 فک کیڑے اُتار لئے، (چونکہ اس طالب علم کے پاس گانا سُنانے کے لئے پیسے نہ
 تھے)۔ علی گڑھ سے واپسی کے بعد فیض الحسن خیال سے میری دوستی پروان چڑھتی
 رہی۔ منشی فاضل (پیشین گریجویٹ) کامیاب کرنے کے بعد میں نے لا کلاس میں
 چلے گیا۔ وکالت کا یہ کورس دوسال کا ہوتا تھا۔ کچھ مہینوں کے بعد میں وکالت
 تعلیم جاری نہ رکھ سکا۔ اُن دنوں میں راشننگ ڈپارٹمنٹ (محکمہ سیول سپلائز)
 بحیثیت کلرک ملازم ہو گیا تھا۔ میں شہر میں گوشہ علی، مغل پورہ اور ملک پیلٹ
 دفاتر میں کام کرتا رہا۔ پھر کچھ مہینوں کے لئے میرا تبادلہ کتہ گڈم (کھم)
 رہو گیا۔



اُجالوں کا سفر

میری بیوی رحمت النساء بیگم بقول میری والدہ کے، مجھ سے اُس وقت
 خوب ہوئی جب وہ صرف ۱۴ دن کی تھی۔ میری بیوی میرے ماموں الحاج
 حبیب الدین کی قیسری بیٹی ہے۔ میری شادی اُس وقت ہوئی جب میری عمر
 ۱۸ سال کی ہوگی۔ میری بیوی نے تعلیمات تک تعلیم پائی ہے (چونکہ
 آباد میں فوقانیہ درجہ کی تعلیم کی سہولت نہ تھی)۔ مگر کاما حول مذہبی اور
 ایتی اورینٹی تھا، اس لئے مذہبی اور اخلاقی تعلیم پر زیادہ توجہ دی گئی۔ میری

بیوی پابند صوم و صلوة ہے۔ برسوں سے وہ تلاوت کلام پاک کے مقدس اور محبوب مشغلہ میں مصروف ہے۔ انہیں میری شعر و شاعری اور ادبی سرگرمیوں سے نہ تو کوئی سروکار ہے اور نہ ہی کوئی دلچسپی۔ مزاجاً وہ فنونِ لطیفہ سے کوئی دلچسپی نہیں رکھتیں۔ میرے شاعرانہ مزاج، میری علمی و ادبی مصروفیات سے کوئی لگاؤ نہیں ہے، البتہ کوئی خاص اعزاز مل جائے تو قدرے خوش ہو جاتی ہیں لیکن خوشی کا اظہار قطعی نہیں کرتیں۔ دراصل انہوں نے بچوں کی دیکھ بھال، گھر کے کام کاج کو اپنی زندگی کا مقصد بنا لیا ہے۔ مشاعروں، ادبی محفلوں میں شرکت کا بالکل شوق نہیں ہے۔ فنونِ لطیفہ کے کسی شعبہ سے بھی دلچسپی نہیں ہے۔ جہاں تواری میں لاثانی ہے۔ میرے گھر جہانوں کا تانتا بندھا رہتا ہے۔ ان کی موجودگی سے میری بیوی کی پیشانی پر بل تک نہیں پڑتے۔ شہر میں میری بہت سی منہ بولی بہنیں ہیں، شاعرات ہیں، خاتون شاگرد ہیں، جو کبھی کبھی میرے گھر آجاتی ہیں تو ان کی تواضع میں کوئی کمی نہیں کرتیں۔

شادی سے پہلے میں نے اپنی بیوی کی صرف ایک جھلک اُس وقت دیکھی تھی جب وہ اپنے گھر کے آگن میں کھڑی ہوئی تھیں۔ شاید ان کی عمر اُس وقت ۹، ۱۰ برس کی ہوگی۔ مجھے دیکھتے ہی وہ شرماکر بھاگ گئی تھیں۔ (چونکہ وہ بچپن میں مجھ سے منسوب ہو چکی تھیں) ہماری منگنی نہیں ہوئی۔ جرجول نے جو کچھ آپس میں گفتگو کی وہی سب کچھ ازراہِ رشتہ کا سنگ میل تھا۔ میری شادی بڑی دھوم دھام سے ہوئی۔ شادی کے وقت میری بیوی کی عمر ۱۸ سال کی تھی۔

میرے بقید حیات اس وقت ۴ لڑکے اور ۳ لڑکیاں ہیں۔ میرا پہلا لڑکا نجیب ۲ سال کی عمر میں انتقال کر گیا، جس کا صدمہ مجھے کئی ہفتوں تک رہا۔ اب بھی جب وہ مجھے یاد آتا ہے تو اُس کی معصوم صورت میری نگاہوں میں پھرنے لگتی ہے اور مجھے بے حد تکلیف ہوتی ہے۔ اس کی صرف دو باتیں میرے دل و دماغ میں پیوست ہو کر رہ گئی ہیں۔ حیدرآباد میں، میں اپنی بڑی بہن کے ساتھ محلہ بھری الاوہ (گھانسی بازار) میں رہتا تھا۔ میرے طالب علمی کا زمانہ بھی وہیں گزرا۔ میری شادی کے بعد میری بیوی اُسی گھر میں رہی۔ ایک دن کو بات ہے کہ میرے لڑکے نجیب کا سیدھا ہاتھ مونڈھے سے سرک گیا۔ جراح بیگم بازار میں رہتا تھا۔ ایک شام جب میں اُس کو گود میں لے کر سٹی کار لے کر گھر لے جانے سے پیدل گزر رہا تھا تو اُس نے مجھ سے چاند کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کچھ کہا تھا۔ وہ لطف احساس آج بھی میری شخصیت کو بڑا کر رکھ دیتا ہے۔ اُس نے اشارتاً یہ کہا تھا کہ ہاتھ میں درد ہو رہا ہے۔ نہایت خوبصورت، گلاب تازہ کی طرح صحت مند بچہ تھا۔ یاد نہیں ہے کہ کس بیماری سے اس کا انتقال ہو گیا۔ نجیب کا انتقال جہنا باد میں ہوا۔ جب وہ زندگی کی آخری سانس لے رہا تھا تو میں نے خدا سے اُس کی حیات کے لئے گڑ گڑا کہ دعا مانگی تھی اب یہ بھی کہا تھا کہ اسے پروردگار اُس کی زندگی کے بدلے میری جان لے لے لیکن میری دعا قبول نہیں ہوئی۔ میری ازدواجی زندگی کا یہ پہلا اور اذیت ناک صدمہ ہے۔ میں کئی دنوں تک سنبھل نہ سکا۔ (پہلی اولاد کا صدمہ بہت تکلیف دہ ہوتا ہے)۔ اس کے بعد طلعت سلطانہ پیدا ہوئی۔

میرے ۴ لڑکوں میں شمس الدین عارف میرا پہلا لڑکا ہے جس نے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے ایم۔ ایس سی کا امتحان درجہ اول میں کامیاب کیا۔ گزشتہ ۸ سال سے دوسرے قطر کی ایک پرائیویٹ کمپنی میں منیجر کی حیثیت سے کام کر رہا ہے۔ عارف بے حد ذہین لڑکا ہے۔ جب وہ سٹی کالج میں زیر تعلیم تھا تو اُس نے ایک سالانہ جلسہ میں کئی انعام حاصل کئے تھے۔ انعام میں ۷ کتابیں بھی ملی تھیں۔ (جواب تک محفوظ ہیں)۔ اس کے سٹی کالج کے شفیع اساتذہ میں جناب فیض الرحمن جعفری اور ڈاکٹر اکرم علی بیگ ہیں۔ عارف نے سٹی ہائی اسکول لاڈ بازار سے اردو ذریعہ تعلیم سے میٹرک کا امتحان درجہ اول میں کامیاب کیا۔ (اُس وقت جناب خواجہ معین الدین صدر مدرس تھے) اُس نے انگریزی ذریعہ تعلیم سے ممتاز کالج سے انٹر میڈیٹ کا امتحان درجہ اول میں کامیاب کیا۔ اس کالج کے پرنسپل محی الدین صاحب تھے۔ وائس پرنسپل محمد عبد العزیز صاحب (محمد عارف کے استاد بھی تھے)۔ اردو کی ممتاز شاعرہ شفیعہ فاطمہ شیری بھی حلیف کی پھر رہ چکی ہیں۔ عارف نے نظام کالج سے بی۔ ایس سی درجہ اول میں پاس کیا۔ ڈاکٹر نیرت ساجدہ، عارف کی پھر تھیں۔ دو سال پہلے ایک گمہ جوئیٹ، باسلیقہ، مشرقی ماحول میں پرورش پائی ہوئی، اطاعت گزار، سلیقہ مند مشرقی اقدار کی پادشاہ، پایہ صمیم و صلوة لڑکی انجمن المسلمین کے والد مشتاق احمد صاحب حکمہ ایل۔ آئی۔ سی۔ آئی۔ سی۔ آئی۔ سی۔ عارف کی شادی ہو گئی۔ عارف کی شادی بغیر جوڑے جوڑے کی رقم کے یہ شادی حیدرآباد کی مثالی شادی تھی جس میں شہر کی سیاسی غیر سیاسی شخصیتیں، ممتاز شہری، صنعت کار، اعلیٰ عہدہ دار، ممتاز صحافی، شاعر

وادیب، پروفیسرز، ڈاکٹرز، انجینئرز اور عزیز و اقارب کی کثیر تعداد نے شرکت کی تھی۔ عارف کے ایک بڑے علمی عارف، جس کے خدو خال عیاں ہے کہ روشن مستقبل اس کی آنکھوں کی چمک کی طرح اُبالوں کا سفر طے کرے گا۔ اور وہ تمام عمر تازہ گلاب کی طرح چمکتی رہے گی۔ دوسری بیٹی بصیرت نور امتثال صبح کی پہلی کرن کی طرح سارے گھر میں نور پراہی ہے۔

سراج الدین سلیم میرا دوسرا لڑکا ہے۔ عثمانیہ یونیورسٹی سے بی۔ ایس سی کامیاب کرنے کے بعد اُس نے لینڈ سروسنگ، کنسٹرکشن اور ڈرافٹسمن سیرول کا ڈپلوما حاصل کیا۔ چند دن اس ٹیکنیکل شعبے سے وابستہ ہو گیا، لیکن بعد میں ٹرانسپورٹ کے ذاتی کاروبار شروع کر دیا۔ الحمد للہ وہ اپنے کاروبار میں کامیاب ہے۔

سراج الدین سلیم نے سٹی ہائی اسکول لاڈ بازار سے میٹرک کامیاب کرنے کے بعد ممتاز کالج سے انٹرمیڈیٹ اور انوار العلوم کالج سے بی۔ ایس سی کا امتحان کامیاب کیا۔ سراج الدین سلیم کی شادی اُس کے ماموں کی لڑکی نصرت سلطانہ سے ہوئی۔ اس کی بیوی بھی سنجیدہ، سلیقہ شعار، سعادت مند، مہمان نواز اور مشرقی تہذیب کی پروردہ ہے۔ میٹرک کامیاب ہے۔ گھریلو کام کاج کے علاوہ اسے مذہبی اور ادبی کتابیں پڑھنے کا شوق ہے۔ یہ دونوں اپنی لذت و زندگی سے خوش ہیں۔ ان کے ایک بیٹی ہے، 'نغم السعدی شان'، نہایت خوبصورت پیاری پیاری، جس کی ذہانت اور اندازِ گفتگو سارے خاندان کے لئے ایک سرمایہٴ فرحت ہے۔

منہاج الدین خسرو میرا تیسرا بیٹا ہے۔ اس کی تعلیم ہائی اسکول سے آگے نہ بڑھ سکی۔ اس کا ترجمان ابتداء ہی سے ٹیکنیکل فیلڈ میں قدم جمائے رکھنے کا تھا۔

چنانچہ اُس نے ویلزنگ اور گرینگ کے کاموں سے واقفیت حاصل کرنے کے بعد گلغشاں کے نام سے محلہ بہادر پورہ میں ایک ورکشاپ کھول رکھا ہے۔ اسے بڑے بڑے آرڈرس ملتے ہیں۔ وہ اپنے کام میں خوش ہے اور آہستہ آہستہ اپنے مالیہ کو مستحکم کرتا جا رہا ہے۔ اس کی عمر ۲۵ سال ہے۔ کچھ دن پہلے اس کی شادی میرے ہی قرابت داروں کی ایک میٹرک کامیاب لڑکی رئیسہ بنت عبدالغنی سے ہوئی۔ جرنہایت سلیقہ مند، نرم طبیعت، منساہ، تہذیبی ماحول کی تربیت یافتہ ہے جس کے قدموں نے بھی ہمارے گھر کی رونق بڑھاؤ نعیم الدین پرویز میرا چچو تھا لڑکا ہے، جس نے سٹی ہائی اسکول لارڈ بازار سے میٹرک پاس کیا۔ ممتاز کالج سے انٹرمیڈیٹ کرنے کے بعد گلبرگہ میں پڑھنے کے۔ سٹی کالج میں بی۔ اے فارمسی میں داخلہ لیا۔ دورانِ تعلیم اُس کے ذہن میں ایک چونکا دینے والا پیرہن بکسٹم پروورش پانے لگا اور اُس نے طے کیا کہ دورانِ تعلیم بدویات کی تیاری کے لئے پودوں کا عرق نکالا جائے چنانچہ گزشتہ دو سال سے ہوتا بادشاہ ایک زمین پر لے کر پودے لگا رہا ہے اور دوائیوں کیلئے متعلقہ کیمینوں کو مان سیکائی کرتا رہتا ہے۔ وہ اپنے منصوبے میں کامیاب ہے اس کی عمر ۲۴ سال کی ہے۔ کچھ بننے کی دھڑکیاں ابھی سب کچھ کر رہا ہے۔

طلعت سلطانہ میری بڑی لڑکی ہے۔ اُس نے جماعت ہفتم تک تعلیم پائی تھی کہ ہم نے اس کی شادی کردی۔ میرا داماد محمد عبدالغیم (میرے چچا زاد بھائی عبدالغیم کا بڑا لڑکا ہے) نہایت سلجھا ہوا، نہایت سنجیدہ، متین، ذہین، محنتی، ایماندار ہوتے کے علاوہ باسلیقہ تاجر پیشہ ہے۔ ٹرانسپورٹ کے کاروبار کیا کرتا ہے۔ اس کی زندگی مطمئن اور باسلیقہ ہے۔ طلعت سلطانہ کے ۴ لڑکے اور ۳ لڑکیاں

ہیں۔ لڑکوں میں وحی الدین شمیم، لیسٹی الدین تسیم، معین الدین وسیم اور شفیق الدین عظیم ہیں۔ اور لڑکیوں میں انجم کہکشاں، شبنم گلستاں اور نایلم زرقشاں تمام بچے دینی اور اخلاقی ماحول میں زیر تربیت ہیں، معیاری اسکول میں تعلیم پاتا رہے ہیں۔

طلعت سلطانہ ایک قبیلہ پیروز، محبت شناس اور معسر وں کے دکھ درد میں شریک ہونے والی لڑکی ہے۔ اپنے بچوں کی تعلیم و تربیت میں خاصہ وقت صرف کرتی ہے۔ خاندان کے لوگوں میں اس کی اہمیت اس لئے بھی ہے کہ وہ سب کے ساتھ شیر و شکر کی طرح رہتی ہے۔ میری دوسری لڑکی عشرت عرفانہ میرٹھ کا کامیاب ہے۔ میں نے اپنے حقیقی بھائی محمد صبار الدین کے دڑ کے رفیع الدین جمیل سے اس کی شادی کر دی ہے۔ رفیع الدین ٹرانسپورٹ کے کارروا کرتا ہے۔ ان دونوں کی ازدواجی زندگی خوشگوار ہے۔ عشرت کے چار لڑکے ہیں، مصباح الدین سہیل، مفتاح الدین فہیل، فلاح الدین فضل اور راجیل۔ عشرت عرفانہ سنجیدہ، بردبار، سلیقہ مند، خوش مزاج، چھوٹوں کا لحاظ اور بڑوں کی عزت و احترام کرنے والی لڑکی ہے۔ اس کی منساری، عزیزوں اور رشتہ داروں میں مثالی ہے۔ زینت نسرین میری تیسری بیٹی ہے، میرٹھ تک تعلیم پانچویں ہے۔ اخلاقی، دینی و ادبی کتابوں کے مطالعہ کا شوق ہے مشرقی ماحول کی دلدادہ ہے۔ گھر کے کام کاج میں اپنی ماں کا ہاتھ بستا ہے۔ میرٹھ ادبی کاموں میں بھی مدد کیا کرتی ہے۔

خدا کا شکر ہے کہ میرے گھر کی فضا ابتداء ہی سے خوشگوار رہی۔

میرے تمام لڑکوں میں آپس میں پیار، محبت و اتحاد ہے، اور ایک سلجھے ہوئے
 خاندان کی طرح ایک دوسرے کی ضرورت کو محسوس کرتے ہوئے ایک دوسرے سے
 تعاون کرتے ہیں۔ ہم سب ایک ہی گھر میں رہتے ہیں۔ ماں باپ کی عزت و
 احترام میں ان لڑکوں نے کوئی کمی نہیں کی۔ ان کا طرزِ عمل اور رکھ رکھاؤ
 خاندانی مثبت اقدار کا ثبوت دیتا رہتا ہے۔

حسن اتفاق سے میرے تینوں لڑکوں شمس الدین عارف، سراج الدین سلیم
 پھر منہاج الدین خسرہ کی بیگمات بھی گھر کے خوشگوار ماحول اور خوش آہنگ فضا
 کو برقرار رکھنے میں اہم حصہ ادا کر رہی ہیں۔



ڈائریکٹریٹ اور سکریٹریٹ کی ملازمت

میں ابھی طالب علم ہی تھا کہ میرا تقرر بحیثیت کلرک عکڑ سیول سپلانز میں ہوا۔ ابتداء میں گوشہ محل، مغل پورہ اور ملک پیٹ کے راشننگ دفاتر میں کام کرتا رہا۔ پھر میرا تبادلہ کچھ مہینوں کے لئے کتہ گوٹم (نھم) چلے ہو گیا۔ جب عکڑ سیول سپلانز میں تخفیف عمل میں آئی تو میں بھی تخفیف کی زد میں آ گیا لیکن جلد ہی میرا اجازت اسی خدمت پر ڈائریکٹریٹ کمیونٹی پروجکٹ میں۔ اسی ۱۹۵۵ء کو ہوا۔ یہ دفتر ایک ویوگیٹ ہاؤس سے متصل عمارت سیول سروس ہاؤس میں تھا۔ جناب مگر و سوامی ڈائریکٹر تھے۔ آفس سپرنٹنڈنٹ محمد عمر خاں اور جناب سچید تھے۔ اس وقت کے میرے ساتھیوں میں عبد الرحیم، منیٹ سنگھ ملک، حاجی امین الدین، علیم الدین، افضل حسین، خواجہ بہار الدین، کشپا کرتا، جی پرہا کر راؤ، جھوڑی، ارجن راؤ، شانتی کارما تھر، نرسمہا ریڈی اور علی نواز خاں، محمد غوری قابل ذکر ہیں۔ جب فضل علی کمیشن کی رپورٹ کی روشنی میں لسانی بنیاد پر ریاستوں کی تقسیم جدید عمل میں آئی تو میرا الاٹمنٹ پلاننگ اینڈ ڈیولپمنٹ ڈیپارٹمنٹ (سکریٹریٹ) میں ہوا۔ میرا عکڑ ڈائریکٹریٹ کمیونٹی پروجکٹ، یکم نومبر ۱۹۵۶ء کی پلاننگ ڈیپارٹمنٹ (سکریٹریٹ) میں ضم ہو گیا۔ سکریٹریٹ جانے کے بعد مجھے ترقی ہوئی، اور ۱۶ جنوری ۱۹۵۷ء کو، میں ایئر ڈیویژنل کلرک (یو۔ ڈی۔ سی) بنا دیا گیا۔ پھر ۵ مارچ ۱۹۵۷ء میں مجھے سکشن آفیسر (گزٹڈ)، کی بحیثیت سے ترقی مل گئی۔ علی گڑھ میٹرک کے استاذ

کے وقت تاریخ پیدائش، اندازاً لکھوانے کی وجہ سے مجھے اپنی صحیح عمر سے پہلے
 وکیلہ حسن خدمت ہو گیا۔ اس کے فوری بعد میں روزنامہ سیاست سے وابستہ ہو گیا۔
 ریاستوں کی تقسیم جدید کے بعد جب آندھرا اور تلنگانہ کے ملازمین ایک ہی
 سرورس لسٹ میں آ گئے تو آندھرا کے ملازمین کو احساس برتری پیدا ہو گیا۔ سکریٹریٹ
 کے ہر محکمہ میں آندھرا کے ملازمین کی تعداد تلنگانہ کے ملازمین کے مقابلے میں زیادہ تھی۔
 آندھرا کے عہدہ داروں اور اسٹاف کو یہ غلط فہمی تھی کہ حیدرآباد کے ہندو ہوں کہ مسلمان
 ملازم، ان کے مزاج میں غلوایت یہ بھائی ہوئی ہے اور تلنگانہ کے ملازمین دفتری کام سے
 کچھ زیادہ واقف نہیں ہیں، اُس وقت حالات کچھ ایسے ہو گئے تھے کہ تلنگانہ کے
 ملازمین احساس کمتری میں مبتلا ہو گئے تھے (اُن کے ساتھ نا انصافیوں کا سلسلہ شروع ہو چکا
 تھا) آندھرا کے ملازمین کو ترقی کے زیادہ مواقع فراہم کئے جا رہے تھے۔ جب آندھرا
 اور تلنگانہ کے ملازمین کی مشترکہ سیناریٹی لسٹ تیار ہوئی تو بعض تلنگانہ ملازمین کی
 سیناریٹی متاخر کر دی گئی۔ یہ ساری بددیانتی ابتدائی مرحلوں میں (سکشن آفیسر اور
 اسٹٹ سکریٹری کی سطح پر) ہوتی تھی۔ اُن دنوں سکریٹریٹ کے اہم عہدوں پر
 آندھرا کے عہدہ داروں کو مقرر کیا جاتا تھا، جس کی وجہ سے تلنگانہ ملازمین کو بڑی
 خراج نقصان پہنچا۔ جب حق تلفی اور نا انصافی بڑھنے لگی تو ملازمین کی مختلف سطح
 کی انجمنیں حرکت میں آ گئیں۔ تلنگانہ کی سرورس لسٹ اسوسی ایشن علیحدہ کام کرنے لگی۔
 آندھرا کے عہدہ داروں نے ہزاروں تلنگانہ ملازمین کو نقصان پہنچایا، وکیلہ پانے
 تک جی وہ نا انصافی کا شکار رہے۔

جب ڈائریکٹریٹ کمیونٹی پروجیکٹ کے ملازمین، پلاننگ اینڈ ڈیولپمنٹ ڈیپارٹمنٹ

(سکریٹریٹ) میں فہم کئے گئے تو اس وقت سکریٹری پلاننگ اینڈ ڈیولپمنٹ مسٹر نسیم تھے۔ انہوں نے ڈائریکٹوریٹ پروجکٹ کے ملازمین (ایل ڈی سی، یو ڈی سی، سکشن آفیسر، ٹائیسٹ اور اسٹینڈ) کو اپنے اجلاس پر بلوایا۔ ہم تمام ان کے روم میں داخل ہوئے۔ انہوں نے ایک اچھٹی سی نظر ہم پر ڈالی اور قدرے برہم ہو کر کہا کہ سکریٹری کے اجلاس پر آتے ہی تمہیں اپنا تعارف کرانا چاہیئے (دراصل وہ اپنے اس رویے سے ہم تنگناہ ملازمین کو مرعوب کرنا چاہتے تھے) ہم یکے بعد دیگرے اپنا تعارف کرانے کے بعد اپنے اپنے سکشن میں چلے گئے۔ سکریٹری کے اس اہانت آمیز رویے نے ہم ملازمین کی عزت نفس کو دھک پہونچایا تھا۔ اس وقت صیف نظامی (او۔ پی) کا اسسٹنٹ سکریٹری لکشمی نارائن تھا جو نہایت مغرور انسان تھا۔ اس کا رویہ محکمہ کے تمام ملازمین کے ساتھ نامناسب رہا کرتا تھا۔ اگر وہ کسی ملازم کو اپنے روم سے باہر کہیں دیکھتا تو بُری طرح ڈانٹتا تھا۔

ایک دن یوں ہوا کہ میں اپنے دوست افضل حسین (ٹائیسٹ) کے پاس چلا گیا تھا (جن کا سکشن میرے سکشن سے متصل تھا) لکشمی نارائن راؤنڈ پر نکلا تھا۔ جیسے ہی مجھے افضل حسین کے پاس کھڑا ہوا دیکھا تو اونچی آواز میں مجھ سے وہاں آئے کی وجہ پوچھنے لگا۔ میں نے اُسی لہجہ میں جواب دیا۔ وہاں سے وہ خاموشی اپنے روم میں چلا گیا اور فوراً مجھے چیرا سی کے ذریعہ بلوایا اور کہا کہ میں آپ کے خلاف ایکشن لے سکتا ہوں۔ میں نے کہا آپ کچھ نہیں کر سکتے۔ وہ غصہ پی کر رہ گیا لیکن اس نے اپنی بد فطرتی کا ثبوت دیتے ہوئے ایک موقع پر میری سینا ریٹی کو متاثر کیا۔

میری ملازمت کی تقریباً تمام مدت اکاؤنٹس سکشن میں گزری۔ شروع شروع میں آندھرا کے بعض سکشن آفیسروں نے مجھ سے تحکمانہ انداز سے کام لینا چاہا لیکن میں نے انہیں اپنے مقصد میں کامیاب ہونے نہیں دیا اور میں نے کبھی مقام پر بھی اپنی شخصیت کو مجروح ہونے نہیں دیا۔ اینٹ کا جواب پتھر سے دیتا رہا۔

میں تقریباً ۱۸ سال تک اسسٹنٹ سکشن آفیسر رہا۔ اس دوران آندھرا کے بعض شریف النفس سکشن آفیسروں کے تحت کام کرنے کا مجھے اتفاق ہوا، جن میں قابل ذکر مسز بی۔ راماجوگاراؤ، کامیشور راؤ، حاجی قاسم، شیخ محمد علی اور ایم۔ وی نرسہماراؤ ہیں۔ سکریٹریٹ میں میری پہلی پوسٹنگ صیغہ انتظامی (بولی) میں ہوئی۔ مسز سی۔ جے راماجوگاراؤ سکشن آفیسر تھے اور مسز آر۔ نرسہماراؤ اسسٹنٹ سکشن آفیسر۔ یہ دونوں بہترین خصلت کے انسان تھے۔ میں ان کے ساتھ نہایت خوشگوار ماحول میں کام کرتا رہا۔ ان دونوں رائے کچھ ہماری نال میرے محکمے میں ڈپٹی سکریٹری کی حیثیت سے آئے تھے۔ وہ ایک شفقتی، مروت شناس، اور نفیس آفیسر تھے۔ ان کے بارے میں مجھے معلوم ہوا تھا کہ وہ شعروادب سے بے حد دلچسپی رکھتے ہیں اور کلکٹر کی حیثیت سے وہ جس ضلع پر بھی رہتے مشاعروں کا اہتمام کیا کرتے تھے۔ جب میرے محکمے میں ان کے تبادلے کے سلسلہ میں مددگار پارٹی ہوئی تو میں نے ایک وداعی نظم سنائی تھی جس کا یہ اثر ہوا کہ انہوں نے میری شاعری کا کھصل کر اعتراف کرتے ہوئے میری حوصلہ افزائی کی۔ اس کے بعد محکمے کے تمام ساتھیوں کے علاوہ عہدہ داران محکمے نے بھی مجھے قدر کی نگاہوں سے دیکھنا شروع کیا۔ میری وہ نظم آج بھی کے بی نال صاحب کے ڈرائنگ روم میں آویزاں ہے۔

کے۔ بی۔ لال صاحب کے زمانے سے ہی میں اپنے حکم میں ایک پسندیدہ بااثر شاعر کی حیثیت سے شہرت پانے لگا۔ اس بدلی ہوئی صورتحال کے بعد سکریٹریٹ کے اعلیٰ عہدہ داروں سے میرے مراسم بڑھنے لگے۔

یوں تو میری ملازمت کے دوران کئی اعلیٰ عہدہ دار آتے جاتے رہے لیکن خاص طور پر تلنگانہ کے ہندو مسلم عہدہ داروں سے میرے اچھے خاصے مراسم تھے، جن میں ایک عہدہ دار عین بن شہیر آئی۔ اے۔ ایس۔ ڈیٹھی سکریٹری تھے، جنھیں اُنڈو شعروادب سے کافی لگاؤ تھا۔ اُن کی میز پر ہمیشہ منتخب اشعار کی دو ضخیم کاپیاں موجود رہتی تھیں۔ وہ ایک سنجیدہ مزاج عہدہ دار تھے، جن سے تمام ملازمین خوش تھے۔ ٹی۔ تاج الدین صاحب (آئی۔ اے۔ ایس) ایک ماہ کے لئے میرے متعلق ڈیٹھی سکریٹری رہے۔ تاج الدین صاحب کے ہاں جب بھی کوئی فائیل کر جانا تو بڑی محنت سے بٹھاتے، پان پش کرتے، پھر موصوفہ اور کی باتیں ہوتیں۔ فائیل کے بارے میں سمجھتے کہ لکھ دیجئے، دیکھ لوں گا۔ ایک دن فائیل نہ دیکھوں تو کیا دنیا ڈوب جائے گی۔ نہایت نفیس، معتبر اور قابل انسان ہیں۔ انہیں بھی شرو و شاعری سے دلچسپی ہے۔ اکثر دفعہ وہ اپنی کلکٹری کے زمانے کے خاص خاص واقعات سنایا کرتے تھے۔ اُسی زمانے میں مسٹر جوہری ڈیٹھی سکریٹری (شعبہ انتظامی) ہوئے۔ مسٹر جوہری ایک نوجوان آئی اے ایس آفیسر تھے۔ لگ بھگ ۳۵، ۳۶ سال کی عمر ہوگی۔ مزاج کے بہت تیز تھے، اور یہ بات مشہور ہو گئی تھی کہ وہ سچے گاندھی کے کاس میٹ تھے۔ تمام اسٹاف اُن سے گھبراتا تھا۔ جیسے ہی انہوں نے جائزہ لیا، کچھ دنوں کے بعد ہی بغیر کسی وجہ کے تقریباً ۱۸ سکشن آفیسرز کو ان کے اپنے

سکشنوں سے ہٹا دیا گیا۔ یہ بات متاثرہ سکشن آفیسر کو اچھی نہیں لگی۔ مجھے بھی اکاؤنٹس سکشن کے سے ہٹا کر پنجایت سکشن کے میں پوسٹ کیا گیا۔ اُس زمانے میں مسٹر ایم باگا ریڈی منسٹر پنجایت راج ڈپارٹمنٹ تھے (جو میرے ہم جماعت اور دوست ہیں)۔ میرے ساتھی مجھے اکسانے لگے کہ مسٹر جوہری کے اس رویے پر انہیں شرمندہ کرنے کے لئے اپنا تعیناتی کے آرڈر منسوخ کر دینے، مسٹر صاحب آپ کے دوست ہیں، اتنا تو کر سکتے ہیں۔ ایک دن میں نے باگا ریڈی صاحب سے کہا کہ جوہری صاحب نے بغیر کسی وجہ کے ۱۸ سکشن آفیسرز کے سکشن بدل دیئے ہیں۔

اتفاق سے اُن سکشن آفیسرز میں سے ایک میں بھی ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ میں اُسی سکشن میں رہوں، جہاں میں پہلے تھا۔ (اس لئے کہ وہاں مجھے سکون ہے نہ تو وہاں رشوت لینے کا مسئلہ ہے اور نہ ہی دفتر میں دیر تک بیٹھنے کی پابندی ہے)۔ باگا ریڈی صاحب نے کہا کہ ایسا ہی ہوگا۔ انہوں نے سکریٹری صاحب سے بات کی، سکریٹری صاحب نے اُن سے کہا کہ فوری عمل کیا جائے گا۔ لیکن تین ہفتہ گزرنے کے بعد بھی کچھ عمل نہیں ہوا، ایک دن میں نے باگا ریڈی صاحب کے نام یہ شعر لکھ کر بھیج دیا۔

جہاں چھوڑا تھا مجھ کو زندہ گئے

ابھی تک اُسی جگہ رہا ہے پرکھڑا ہوں

اتفاق سے اُس وقت اُن کے اجلاس پر میرے ڈپارٹمنٹ کے تمام اعلیٰ عہدیداروں کی میٹنگ ہو رہی تھی۔ باگا ریڈی صاحب نے جوہری صاحب سے کہا کہ آج ہی صلاح الدین نیسٹر آرڈر جاری کئے جائیں اور اُن کی پوسٹنگ اُسی سکشن میں کی جائے

جہاں وہ پہلے تھے۔ مسٹر جوہری، منسٹر صاحب کے اجلاس سے اپنے روم کو واپس ہوئے اور باگاریٹی صاحب کے حکم کی تعمیل کی۔ اس کے بعد وہ منسٹر صاحب کے ذریعہ مجھے بلوایا۔ میں اُس وقت لپنج کے بعد چائے پینے کے لئے اپنے دوستوں کے ساتھ کافی ہاؤزیں بیٹھا تھا۔ وہاں چیراسی آیا اور مجھ سے کہا کہ جوہری صاحب بٹار ہے ہیں۔ میں سمجھ گیا کیوں بلایا جا رہا ہے۔ میں دستک دے کر جوہری صاحب کے روم میں داخل ہو گیا۔ سلام کر کے کرسی پہنچ کر اُن کے ممبرو بیٹھ گیا۔ مجھے ان کے چہرہ کی رنگت سے اندازہ ہو گیا کہ بغیر اجازت میرا بیٹھنا انہیں ناگوار گذرا ہے۔ کیونکہ سسشن آفیسر ہوں یا اسسٹنٹ سکرٹری، دروازہ یہ کھڑے رہ کر ہندو آنے کی اجازت مانگتے تھے اور وہ اُس وقت تک کھڑے رہتے جب تک کہ مسٹر جوہری بیٹھنے کیلئے نہیں کہتے۔ مجھ سے انہوں نے غفلت کے ساتھ کہا کہ آپ نے منسٹر صاحب سے میری شکایت کیوں کی۔ میں کسی کی پرواہ نہیں کرتا۔ منسٹر صاحب اگر آپ کے دوست ہیں تو اس سے مجھے کیا۔ اگر میں چاہوں تو آپ کے خلاف ایکشن لے سکتا ہوں (کیونکہ آپ نے منسٹر صاحب سے ڈائریکٹ ملاقات کی ہے)۔ میں نے کہا کہ بگاریٹی صاحب جہاں میرے متعلق منسٹر صاحب ہیں وہ میرے دوست بھی ہیں۔ دوست کی حیثیت سے مجھے یہ حق پہنچتا ہے کہ میں اپنی بات اُن سے کہوں۔ پھر میں نے کہا میری پوری سروس میں آپ پہلے آفیسر ہیں جو اپنے اسٹاف کے ساتھ اس قسم کا نامناسب رویہ اختیار کئے ہوئے ہیں۔ پھر میں نے کہا آپ کی دعا سے سارا سکرٹریٹ میری انتہائی میں ہے۔ میں یہیں سے کسی بھی اعلیٰ عہدہ دار سے یا منسٹر سے فون پر بات کر سکتا ہوں۔ (یہ بات میں نے اس لئے کہی کہ اُن دنوں سکرٹریٹ

کے تمام اُردو جاننے والے مسٹر اور اعلیٰ عہدہ داروں سے میری اچھی خاصی پہچان تھی، اور ما میر، ساعی اور سکریٹریٹ اُردو موسی ایشن کی سرگرمیوں سے واقف تھے۔ قدرے تاخیر کے بعد جوہری صاحب نے مسکراتے ہوئے کہا کہ میں نے آرڈر پاس کر دیئے ہیں۔ آپ اپنے سابقہ سٹیشن میں رہ سکتے ہیں۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ یہ بات آپ مجھ سے کہہ سکتے تھے، مسٹر صاحب کو رحمت دینے کی کیا ضرورت تھی۔ میں نے جواباً کہا کہ آپ سے کوئی لازم بھی بات نہیں کر سکتا۔ اس لئے کہ آپ کا رویہ اپنے ماتحتین کے ساتھ اچھا نہیں ہے، معاف کیجئے گا آپ مزاج کے بہت تمیز میں اور یہ بات سب کو معلوم ہو چکی ہے۔ انہوں نے کہا کہ کیا میں اتنا بُرا ہوں۔ اس گفتگو کے بعد شکریہ ادا کر کے اُن کے روم سے نکلا اور دوسرے دن میں اپنے سابق سٹیشن میں اپنی نشست بستھال۔ کچھ دن بعد مسٹر جوہری نظام آباد کے کلکٹر بن گئے۔ اُن دنوں ٹکٹوں ہال نظام آباد میں یکسی ادبی انجمن کی جانب سے مشاعرہ منعقد کیا گیا تھا۔ جب میں حیدر آباد کے شاعروں کے ساتھ مشاعرہ گاہ پہنچا تو وہاں مسٹر جوہری کے علاوہ ریاستی مسٹر سستیل سنگھ بشکری اور ڈپٹی اسپیکر اسمبلی جناب سید رحمت علی شہ نشین پر تشریف فرما تھے۔ مسٹر جوہری اور دونوں جہانوں کو سلام کر کے میں شہ نشین پر مسٹر جوہری کے بالکل بازو بیٹھ گیا۔ مسٹر جوہری نے ان دونوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ مسٹر شیر سکریٹریٹ میں میرے ڈپارٹمنٹ میں تھے۔ اُن دونوں نے کہا کہ یہ ہمارا شہر کے بہت مشہور شاعر ہیں، یہ ہمارے دوست بھی ہیں۔ اس جواب سے جوہری صاحب کو تھوڑی سی شرمندگی ہوئی۔ اس مشاعرہ کے کچھ مہینوں بعد حکومت کی سطح پر نظام آباد میں

مسٹر جوہری کی نگرانی میں ایک نئی ہند مشاعرہ منعقد ہوا جس میں، میں بھی مدعو تھا۔
(اس مشاعرہ میں خاتر بارہ ہنکوی نے بھی شرکت کی تھی) مشاعرہ میں مسٹر جوہری
نے میرا بھی پرتپاک خیر مقدم کیا۔ کچھ دنوں بعد مسٹر جوہری سے سکریٹریٹ میں بھی
ملقات رہی۔ وہ مجھ سے بڑی محبت سے ملے۔

پینچایت راج ڈیپارٹمنٹ میں کچھ عرصہ کے لئے مسٹر گرو داس بھی سکریٹری
کی حیثیت سے آئے تھے۔ اُن کے دور میں ملازمین انتہائی پرسکون رہے۔ مسٹر گرو داس
کاستھ گھرانے سے تعلق رکھتے ہیں، ان کا سلوک ملازمین کے ساتھ نہایت دوستانہ رہا۔
سکریٹریٹ کی اپنی ساری مدت ملازمت میں، روشن خیال سکریٹری
مسٹرین کے سیٹھ کو میں کبھی نہیں بھلا سکتا۔ اُن کا دور میرے محکمہ کے لئے انتہائی
روشن دور تھا۔ اُن کے زمانے میں ملازمین کی ترقی کے لئے جتنے مواقع فراہم ہوئے
کسی اور سکریٹری کے دور میں نہیں ہوئے۔ سکریٹریٹ اُردو اسوسی ایشن کے ایک
جلسہ میں، میں نے انہیں مدعو کیا تھا، اس کے بعد سے اُن سے میرے مراسم بڑھنے لگے۔
(اُن کے زمانے میں مسٹر ایس اے واسع ڈپٹی سکریٹری تھے)۔ مسٹر سیٹھ ترقی پسند
خیالات کے حامل ایک اعلیٰ آفیسر تھے، انہیں ممتاز شاعر مخدوم محی الدین کی شاعری بہت
پسند تھی۔ اُردو زبان سے دلچسپی تھی۔ روانی کے ساتھ اُردو بولتے تھے، البتہ اُردو
لکھنے پڑھنے میں انہیں دقت محسوس ہوتی تھی۔ سیاست اخبار کے وہ قاری تھے۔

انہوں نے مجھ سے اُردو بڑھنا شروع کیا۔ میں اُن کے مطالعہ کے لئے اُردو کتابیں
دیا کرتا تھا۔ ہفتہ میں ایک دو یا تین کے بعد مجھے چائے پر بُلاتے۔ یہ اُن کا معمول
تھا۔ یہ سلسلہ کئی ماہ تک چلتا رہا۔ جب سکریٹری صاحب سے میرے مراسم کی محکمہ میں

شہرت ہوئی تو بعض ساتھیوں نے سرویس کے بعض نازک مواقع پر مجھ سے اصولی طور پر تعاون حاصل کیا۔ سکریٹریٹ کے ہر محکمہ کا یہ طریقہ کار ہے کہ سال، دیڑھ سال کے بعد ملازمین کی ترقی کے سلسلے میں پیمائش بنتا ہے جس کی منظوری (سکشن آفیسر اور دیگر گزٹڈ پوسٹ) کے لئے متعلقہ ڈپارٹمنٹ کے سکریٹری کے علاوہ دیگر محکموں کے دو اور سکریٹریز کی ضرورت ہوتی ہے۔ ایک پیمائش کی منظوری کے بعد دوسرے پیمائش کی منظوری کے لئے کم از کم ایک سال کا وقفہ ضروری ہے لیکن مسٹر سیٹھ کی شخصی دلچسپی کی وجہ سے چھ ماہ پہلے ہی میرے ساتھ ہونے والے سکشن آفیسر کے پیمائش کی منظوری حاصل کی گئی۔ میری خواہش پر مسٹر سیٹھ نے مقررہ طریقہ کار کو نظر انداز کرتے ہوئے اپنے اختیارات کو کام میں لا کر ہمارا پیمائش منظور کیا۔ مسٹر ایس۔ اے۔ واسع ڈپٹی سکریٹری نے یہ انکشاف کیا کہ دیگر دو سکریٹریز میں سے ایک نے دستخط کرنے سے تامل کیا تو مسٹر سیٹھ نے اپنا پن اُن کے ہاتھ میں تھما دیا اور یہ کہتے ہوئے دستخط حاصل کی کہ میں اپنے ماتحتین کو اپنے اختیار کے دائرہ میں رہ کر زیادہ سے زیادہ فائدہ پہونچانا چاہتا ہوں، کل کا کیوں انتظار کریں۔ کل تو انہیں یہ حق مل ہی جائے گا۔ اس پیمائش کی منظوری سے تقریباً ۲۰۱۸ سسٹمیٹک سکشن آفیسر، سکشن آفیسر بننے کے موقف میں آ گئے۔ چنانچہ پیمائش کی منظوری کے دوسرے دن سے ہی سلسلہ دار ترقی ملتی رہی۔ مسٹر سیٹھ کے اس مشفقانہ سلوک سے محکمہ میں مسرت کی لہر دوڑ گئی۔ ایسے مہربان، انسان دوست ہمہ دار بہت کم ملتے ہیں جو اپنے ماتحتین کو فائدہ پہونچا کر خوشی محسوس کرتے ہیں۔

سکریٹریٹ کے کچھ عہدہ دار جو اپنے دور میں بے حد مقبول رہے

یس۔ اے۔ قادر ایڈیشنل چیف سکریٹری

سکریٹریٹ کے وہ اعلیٰ عہدہ دار جن سے میرے اچھے خاصے مراسم تھے اور جن کی کرم فرمائیاں میں نے بہت سے ملازمین سرکار اور دوسرے اہل غرض اصحاب کی مدد کی، انہیں فائدہ پہنچایا، اُن میں سے ایک نام جناب یس۔ اے۔ قادر ایڈیشنل چیف سکریٹری کا بھی ہے۔

جس وقت جناب یس۔ اے۔ قادر ایڈیشنل چیف سکریٹری تھے تو اُس زمانے میں جناب محمد نظام الدین اسسٹنٹ سیکشن آفیسر محکمہ ٹرانسپورٹ کی سیارٹی متاثر ہو گئی تھی۔ جب اُن کی فائل تصفیہ کے آخری مرحلہ پر قادر صاحب کے پاس پہنچی تو نظام الدین صاحب میرے پاس آئے اور سفارش کی خواہش کی۔ ایک دن میں نظام الدین صاحب کو اپنے ہمراہ لے کر قادر صاحب کے اجلاس پر گیا۔ کیس کے بارے میں تفصیل بتلائی تو قادر صاحب نے کہا کہ یہ فائل میری میز پر ہے۔ انہوں نے نظام الدین صاحب سے کیس کے بارے میں کچھ استفسارات کئے۔ مجھ سے کہا کہ سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ ایک ہفتہ کے اندر احکامات جاری ہوئے۔ نظام الدین صاحب

کی سینارٹی کا تصفیہ حسبِ منشاء ہوا اور انہیں ترقی ملی۔ (اسپیشٹل سکرریٹری بننے کے بعد ریٹائرڈ ہو گئے)۔

ایک اور سفارش کا ذکر کرنا چاہوں گا۔ ممتاز شاعر علی الدین نوید کے بڑے بھائی محمد مصلح الدین، آندھرا پردیش پبلک سروس کمیشن میں ٹائپسٹ تھے۔ (ان دنوں قادر صاحب صدرین آندھرا پردیش سروس کمیشن تھے) مصلح الدین صاحب کا تبادلہ پبلک سروس کمیشن کی کھمبہ برانچ پر ہو گیا تھا۔ ایک دن میں مصلح الدین کو اپنے ہمراہ لے کر قادر صاحب کے گھر واقع حایت نگر پہنچا، ساری تفصیل بتلائی، قادر صاحب نے فی الفور تبادلے کے آرڈر کو منسوخ کیا اور مجھ سے کہا کہ اگر آئندہ ایسی کوئی بات ہو تو مجھ سے ملنے میں تکلف نہیں کرنا، میں ہر منزل پر ہر ممکن تعاون کروں گا۔ ایس۔ اے۔ قادر صاحب سکرریٹریٹ اُردو اسوسی ایشن کے پہلے سرپرست اعلیٰ تھے۔ ان کے زمانے میں سکرریٹریٹ اُردو اسوسی ایشن کے بہت سے اچھے اچھے پروگرامس ہوئے۔ ایک پروگرام جو سکرریٹریٹ کے کمیٹی ہال میں منعقد ہوا تھا۔ قادر صاحب نے بھی شرکت کی تھی، جلسہ انہیں کی صدارت میں منعقد ہوا تھا۔ ایسے جذب، شائستہ اور ماتحت نواز اعلیٰ عمدہ دلوں کے نام سکرریٹریٹ کی تاریخ میں جگمگاتے رہیں گے۔



بھارت چند کھنڈہ آئی۔ اے۔ ایس

جناب بھارت چند کھنڈہ نے میرے کہنے پر بے شمار فوجوانوں کے پاسپورٹ

فارم کی تصدیق کی۔ جن کی وجہ سے کئی مسلم نوجوان باسانی پاسپورٹ حاصل کر سکے جو آج خلیجی ممالک کے علاوہ امریکہ، شکاگو، کینڈا، لندن اور دیگر ممالک میں اچھی اچھی خدمات پر فائز ہیں۔ اُس زمانے میں پاسپورٹ بتانے کے لئے ڈیپٹی سکریٹری سطح کے آفیسر کی پاسپورٹ فارم پر دستخط ضروری تھی۔ (آج بھی ضروری ہے)۔ ایک مرتبہ یوں ہوا کہ میرے ایک رشتے دار کا لڑکا پاسپورٹ فارم پر تصدیق کے لئے میرے پاس آیا۔ کھنہ صاحب اُن دنوں سکریٹری گورنر آندھرا پردیش تھے۔ میں نے کھنہ صاحب کے پاس اپنا ویزٹنگ کارڈ بھجوایا۔ انہوں نے مجھے فوری بلوایا۔ چائے پلوائی۔ میں نے فارم پیش کرتے ہوئے کہا کہ یہ نوجوان باہر بیٹھا ہوا ہے، آپ کہیں تو استفسارات کے لئے بلالوں۔ کھنہ صاحب نے کہا کہ میرے لئے بھی کافی ہے کہ آپ لائے ہیں۔ اُن کے اس پُر اعتماد جواب نے مجھے ہمیشہ کے لئے اُن کا گرویدہ بنا دیا۔

کھنہ صاحب سیدھے سادے، نیک سیرت اور وضع دار ہونے کے علاوہ حمید آبادی تہذیب کا مکمل نمونہ ہیں۔ وہ پاسپورٹ فارم ہو یا کوئی دستاویز بلا تامل دستخط کیا کرتے تھے۔ صدر سکریٹریٹ اردو اسوسی ایشن کی حیثیت سے بھی اُن کا ہمیشہ تعاون حاصل رہا۔ وہ ایک کامیاب طنز و مزاح نگار کی حیثیت سے بھی اردو ادب میں اپنا ایک اہم مقام رکھتے ہیں۔



سید ہاشم علی اختر آئی اے ایس

جس زمانے میں جناب سید ہاشم علی اختر انجینئر ڈپارٹمنٹ کے محکمہ میں تھے تو اس محکمہ کے میرے ایک دوست جناب بشیر انور اسٹنٹ سکن آفیسر تھے۔ سید ہاشم علی اختر صاحب سکریٹریٹ کے ایک نئے محکمہ کمانڈ ایریا ڈیولپمنٹ میں سرکاری بن گئے تو میری سفارش پر بشیر انور صاحب کو اپنے محکمہ میں لے لیا چونکہ وہ ایک تیار ڈپارٹمنٹ تھا اس لئے بشیر انور اپنے دوسرے ساتھیوں کے مقابلے میں وقت سے پہلے سکن آفیسر ہو گئے۔

ہاشم علی اختر صاحب کی عزتوں کا ایک اور واقعہ کچھ اس طرح ہے۔ میرے ایک دوست محبوب احمد محکمہ روڈ اینڈ بلڈنگ میں اسٹنٹ انجینئر تھے۔ محکمہ کی لاپرواہی کی وجہ سے ان کے پرموشن کا کس متاثر ہو گیا تھا۔ یہ مشکل تمام ان کا نام پیان میں شریک کیا گیا تھا۔ پیان کی منظوری کے ایک رکن سکریٹری میسر تھے۔ ایم۔ احمد بھی تھے جن سے سفارش کروانی تھی۔ میں محبوب احمد صاحب کو اپنے ہمراہ لے کر ہاشم علی اختر صاحب کی قیام گاہ (سری نگر گاہ) پہنچا۔ (محبوب احمد صاحب گھر میں نہیں آتا چاہتے تھے، وہ باہر ہی موٹر میں بیٹھے رہے) ہاشم علی اختر صاحب ڈرائیونگ روڈ میں تھے باہر آئے اور اپنے ساتھ مجھے ڈرائیونگ روڈ میں لے گئے۔ رمضان کا مہینہ تھا، افطار کے بعد مجھے بھی عشاء میں شامل کیا گیا جب میں نے اُن سے ملاقات کی وجہ بتائی اور کہا کہ میرے ایک دوست محکمہ کے

عدم تعادل کا شکار ہو چکے ہیں۔ اگر آپ اصولی طور پر اعانت فرمائیں تو میں آپ کا شکر گزار رہوں گا۔ ہاشم صاحب نے فی الفور کہے۔ ایم۔ احمد صاحب کو فون کیا۔ اللہ کے فضل سے سفارش کام آئی اور پیپل کی منظوری کے بعد بہت جلد محبوب احمد صاحب کو ترقی مل گئی۔ ہاشم علی اختر صاحب کے لئے یہ بہت معمولی کام تھا۔ انہوں نے دورانِ ملازمت بہت سے مستحق اور ضرورت مند اصحاب کی مدد کی ہے۔ ہاشم علی اختر صاحب ہمیشہ مجھ سے خندہ پیشانی سے ملتے رہے، وہ میری شاعری سے بہت متاثر ہیں، مجھے مشورہ دیتے تھے کہ میں اپنا کلام ہندی رسم الخط (دیوناگری) میں شائع کرواؤں۔ مجھ سے کہتے کہ میں قلم کا مزدور ہوں۔ دورانِ ملازمت میں سنجواریلڈی کا بھی تذکرہ کیا کرتے تھے۔ ہاشم علی اختر صاحب نے نہایت دیانت دار، فرض شناس، یامروت اور بے باک اعلیٰ آفیسر کی طرح سکریٹریٹ کے درو دیوار پر اپنی شرافت کے گھرے نقوش چھوڑ چکے ہیں۔ سکریٹریٹ کی پچھلی روایات کو چمکانے والوں میں ہاشم علی اختر صاحب کا نام بھی سرفہرست رہے گا۔



غلام احمد

جوائنٹ سکریٹری

غلام احمد صاحب سکریٹریٹ کے ان خوش مزاج، خوش اخلاق اور دلنواز ہمدہ داروں میں سے ایک تھے، جنہوں نے مجھ سے مستحق نوجوانوں کے تقررات

اگر پریشان حال ملازمین کے تبادلوں کی منسوخی کے علاوہ بعض سرکاری اور غیر سرکاری امور میں بھی بھرپور تعاون کیا۔ میں جب بھی اُن سے ملنے جاتا اتھائی خلوص کے ساتھ پیش آتے۔ سگریٹ پیش کرتے، چائے نوشی ہوتی اور کہتے بولو کیسے آنا ہوا۔

غلام احمد صاحب کا اجلاس ایک شاہی دربار جیسا تھا مگر فقیرانہ رنگ لگتا۔ ہر قسم کے ضرورت مند اصحاب کے علاوہ دوست احباب کی آمد کا سلسلہ دفتر کے شروع ہونے سے ختم ہونے تک جاری رہتا۔ ہر شخص کی مدد کرتے۔ ایسا یار باش عہدیدار سگریٹریٹ کو پھر نصیب نہ ہو سکا۔ سفارش کرنے کے معاملے میں وہ بہت سخی واقع ہوئے تھے۔ کوئی شخص اُن کے قلندرانہ دربار سے خالی ہاتھ نہیں گیا۔ صدر سگریٹریٹ اردو اسوسی ایشن کی حیثیت سے بھی ان کی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔



یس۔ اے۔ واسع

جوائنٹ سگریٹری

جس وقت جناب یس۔ اے۔ واسع محکمہ ٹرانسپورٹ میں اسسٹنٹ سگریٹری تھے ٹوبہ میری اُن سے پرہیزی ملاقات ہوئی۔ اُنہیں شعر و ادب سے کافی دلچسپی تھی۔ میں اُن کی خواہش پر اُنہیں مختلف شعراء کا کلام بڑھتے کیلئے دیا کرتا تھا۔ رفتہ رفتہ ہمارے روابط بڑھتے گئے اور ایک وقت ایسا بھی آیا کہ

وہ میرے حکم میں ڈپٹی سکریٹری کی حیثیت سے آئے۔ پھر تو ملاقاتوں کا سلسلہ دراز ہوتا گیا۔ ان کی پُرکشش شخصیت میں کچھ ایسی بات تھی کہ بار بار ملنے کو جی چاہتا تھا۔ واسع صاحب صیغہ انتظامی (او۔ پی) کے ڈپٹی سکریٹری تھے۔ ان کے تحت عازمین کے بہت سے مسائل حل طلب رہا کرتے تھے، جیسے مختلف سکشنس میں تعیناتی، پرموشن کیس، رحمتیں، حکانات اور موٹر سیکل کے قرضہ جات وغیرہ۔ ان سے روابط کی بنیاد پر میں نے اپنے آفس کے ساتھیوں کی بہت مدد کی ہے۔ واسع صاحب میری ہر بات کا خیال رکھتے تھے۔ اُس زمانے میں آندھرا کے ایک ٹائیسٹ مسٹر نرسہا راؤ نے اپنی بعض خانگی الجھنوں کی وجہ سے ملازمت سے استعفیٰ دیدیا تھا۔ ایک دن وہ مجھ سے اور میرے ساتھی خواجہ بہار الدین سے ملے اور تم دیدہ ہو کر کہا کہ میں بہت پریشان ہوں، استعفیٰ واپس لینا چاہتا ہوں۔ میری مدد کیجئے۔ ہم دونوں نے واسع صاحب سے سفارش کی اور انہوں نے استعفیٰ منظور ہونے کے باوجود اس کو دوبارہ ملازمت میں لے لیا۔ آج وہ ٹائیسٹ، ہوم ڈیپارٹمنٹ میں اسٹیشن سکشن آفیسر ہے۔ واسع صاحب کا دور بیچاریت راج ڈیپارٹمنٹ کے لئے ایک سنہرا دور تھا۔ اُن کے زمانے میں کسی بھی ملازم کی تنہائی نہیں ہوئی۔ واسع صاحب اپنے رکھ رکھاؤ، بہترین سلوک اور اپنے باوقار لب و لہجہ کی وجہ سے کافی شہرت رکھتے تھے اُن میں اتنی آفیسر کی وہ تمام خصوصیات شامل تھیں جو اُن کے عہدہ کے لئے ضروری سمجھی جاتی تھیں۔ وہ ایک خوش مزاج اور خوش نظر عہدہ دار کی حیثیت سے بھی پسند کئے جاتے تھے۔ انہوں نے ہمیں محسوس ہی ہونے نہیں دیا کہ وہ ہمارے آفیسر۔ خاص طور پر خواجہ بہار الدین اور مجھ سے وہ بہت

نکھسل کر گفتگو کرتے تھے، دوستوں کی طرح۔ اُس وقت ان کی بذلہ سنجی اور رنگ لاتی جب اُن کے روم میں ایس۔ اے۔ عزیز، خواجہ بہار الدین بھٹو موجود ہوتے۔ ان نشستوں کے بعض لمحات ہمیشہ یاد رہیں گے

واسح صاحب جب سکریٹریٹ اُردو اسوسی ایشن کے صدر ہوئے تو انہوں نے اسوسی ایشن کے لئے غیر معمولی کارنامے انجام دیئے۔ اُن ہی کے زلمے میں بڑے بڑے جلسے ہوئے۔ سکریٹریٹ کی تاریخ میں ایک دستاویزی مجموعہ شائع کیا گیا۔ تھا (جس کو میں نے ترتیب دیا تھا) جس میں ہر محکمہ کی ایسی نمائندہ شخصیتوں، اُردو دوستوں (سکریٹری سے لے کر ایل۔ ڈی۔ سی) تک کے گروپ فوٹوز شامل کئے گئے ہیں جو اُردو زبان و ادب سے محبت رکھتے ہیں۔



محمد تاج الدین آئی۔ اے۔ ایس

جناب تاج الدین، ضلع عادل آباد، کی کلکٹری کرنے کے بعد جب پنجاب راج ڈپارٹمنٹ میں ڈپٹی سکریٹری کی حیثیت سے آئے تو یہ بات عام ہو گئی تھی کہ وہ ایک نیک دل، یا صلاحیت، یا مروت اور طائزین کے ساتھ ہمدردانہ سلوک رکھنے والے عہدہ دار ہیں۔ تاج الدین صاحب مجھ سے غائبانہ طور پر واقف تھے۔ ایک دن جب وہ اپنے روم سے نکل کر سکریٹری کے پاس جا رہے تھے تو میں نے

انہیں سلام کیا، انہوں نے مسکراتے ہوئے سلام کا جواب دیا اور کہا کہ مجھ سے کبھی مل لیجئے۔ میں دوسرے دن ان کے اجلاس پر پہنچا گیا۔ سلام کے بعد انہوں نے بیٹھنے کے لئے کہا اور پان کی ڈبیہ میرے سامنے بڑھاتے ہوئے کہا کہ آپ کون سے سسٹن میں کام کرتے ہیں۔ میں آپ سے واقف ہوں، آپ کی شاعری سُنتا اور پڑھتا رہتا ہوں۔ اس پہلے تعارف کے بعد ان سے ملنے کے لئے کبھی کبھی جایا کرتا تھا، دیر تک وہ اپنے پاس بٹھاتے، اپنی کلکری کے خاص خاص واقعات سناتے شہر و شاعری کے موضوع پر گفتگو کرتے۔ انہیں مجھ سے کافی لگاؤ ہو گیا تھا۔ اپنے وظیفہ سے پہلے وہ مجھ سے کچھ زیادہ ہی کھل گئے تھے۔ ان کی جس بات نے مجھے زیادہ متاثر کیا وہ ان کی مشفقانہ طبیعت تھی اور وہ خلوص آمیز رویہ تھا جو ہمیشہ محبت کرنے والوں کی جھولیوں میں بھر دیتا ہے۔



بی۔ این۔ واگھرے آئی اے ایس

واگھرے صاحب سے میری پہلی ملاقات اُس وقت ہوئی جب وہ ایک دن پانچ کے بعد اپنے روم میں صوفے پر لیٹے ہوئے نیند کی آغوش میں جراتے والے تھے۔ جیسے ہی میں دستک دے کر کمرہ میں داخل ہوا، واگھرے صاحب چونکے۔ میں واپس ہوا ہی چاہتا تھا کہ انہوں نے لیٹے ہوئے ہی کہا کہ فائیل

سیز پر رکھ دیجئے، بعد میں دیکھ لوں گا۔

سکرٹریٹ میں تلنگانہ کے بعض ایسے وضع دار آفیسر بھی رہے جو اپنے ماتحتین سے ہمیشہ دوستانہ اور برادرانہ سلوک روا رکھتے تھے، اُن میں سے ایک ایسے ہی آفیسر وانگرے صاحب تھے۔ وانگرے صاحب کچھ دنوں کے لئے میرے سکشن (افائنس) کے ایجنڈے کی ڈپٹی سکرٹری رہے۔ دوسری دفعہ میں اور میرے ایک دوسرے سکشن آفیسر ساتھی قادری صاحب اپنی اپنی فائیلیں لے کر وانگرے صاحب کے اجلاس پر پہنچے۔ قادری صاحب اور وانگرے صاحب کے دیرینہ مراسم تھے۔ قادری صاحب نے وانگرے صاحب کے سامنے پان کی ڈبیہ بڑھادی۔ اس کے بعد مختلف فائیلیں پر گفتگو رہی۔ قادری صاحب نے اپنی ایک فائل جس کا ٹائپ شدہ نوٹ ڈیڑھ صفحہ کا تھا، وانگرے صاحب کی خدمت میں پیش کیا۔ وانگرے صاحب نے قادری صاحب سے کہا کہ قبلہ پڑھئے تو کیا لکھا ہے آپ نے؟ قادری صاحب نصف صفحہ بھی پڑھئے نہ پامائے تھے کہ انہیں نیند کا جھونکا آگیا اور ان کی گردن بالکل جانب ڈھنک گئی لیکن انگلی اسی سطر پر تھی جس وقت نیند کا جھونکا انہیں آیا تھا۔ جب پڑھتے پڑھتے قادری صاحب رک گئے تو وانگرے صاحب نے کہا اگلا مرشد! آگے پڑھئے۔ قادری صاحب چونکے، انہوں نے پھر پڑھنا شروع کیا، اب کچھ اور سطروں کے بعد قادری صاحب کو پھر نیند کا جھونکا آگیا تو وانگرے صاحب نے کہا کہ پھر سو گئے قبلہ! اس کے بعد وانگرے صاحب نے قادری صاحب سے فائیل لے لی۔ قادری صاحب نے سہوٹا یا بے خیالی میں پی۔ ٹی۔ او کی جگہ دستخط کئے تھے، یہ سمجھ کر کہ نوٹ ختم ہو گیا ہے۔ وانگرے صاحب نے کہا کہ

ابھی جناب ! یہ کیا کیا آپ نے۔ نوٹ ابھی ختم کہاں ہوا ہے۔ واکھرے صاحب نے مسکراتے ہوئے فائیل پاس کر دی۔ ایسا علی ظرف، خوش مزاج آنیسر بہت کم ملتے ہیں جو سکریٹریٹ کے لئے ایک قیمتی ورثہ تھے۔



یس۔ اے۔ عزیز

ایڈیشنل سکریٹری

جناب یس۔ اے۔ عزیز، جس وقت محکمہ جنرل ایڈمنسٹریشن میں ٹپٹی سکریٹری (ایڈمنسٹریشن) تھے، تو انہوں نے میری خواہش پر بعض اصحاب کے شکایات کے ایڈمنسٹریشن میں مجھ سے مکمل تعاون کیا۔ وہ سکریٹریٹ اردو اسوسی ایشن کے نائب صدر تھے۔ اسوسی ایشن کی سرگرمیوں میں حصہ لیتے رہے۔ عزیز صاحب ایڈیشنل سکریٹری جنرل ایڈمنسٹریشن کی حیثیت سے ریٹائرڈ ہوئے۔

عزیز صاحب سے میری ملاقات زیادہ تر جناب یس۔ اے۔ واسع جوانمٹ سکریٹری پنہایت راج کے روم میں ہوا کرتی تھی، سکریٹریٹ اردو اسوسی ایشن کے مختلف پروگرامس کی صورت گری کے سلسلے میں مفید مشوروں سے نوازتے تھے نہایت سیدھے سادے، شریف النفس انسان تھے، اعلیٰ عہدہ پر فائز ہونے کے باوجود بھی انہوں نے اپنے سکریٹریٹ کے قدیم ساتھیوں کو کبھی فراموش نہیں

کیا۔ ان میں کبھی بھی آفیسرانہ شان نظر نہیں آئی۔ مجھ سے تو وہ ایک بڑے بھائی کی طرح ملتے تھے۔ ایسے ہی آفیسرز سے سکریٹریٹ کی رونق تھی۔ یکے بعد دیگرے ایسے بہترین انسانوں نے آفیس عہدیداروں سے سکریٹریٹ خالی ہوتا جا رہا ہے جب بھی سکریٹریٹ جاتا ہوں تو محسوس ہوتا ہے کہ وہ لوگ اب بھی اپنی کرسیوں پر موجود ہیں۔



صادق احمد

جوائنٹ سکریٹری

صادق احمد صاحب سے میری پہلی ملاقات اُس وقت ہوئی جبکہ وہ محکمہ قانون میں اسسٹنٹ سکریٹری تھے (جو جوائنٹ سکریٹری کی حیثیت سے ریٹائر ہو گئے)۔ انہیں اُردو شعر و ادب سے اچھا خاصہ شغف ہے۔ سکریٹریٹ اُردو اسوسی ایشن کے پروگرامس میں کافی دلچسپی لیتے رہے۔ وہ سکریٹریٹ اُردو اسوسی ایشن کے تقریباً ۴ سال تک صدر رہے۔ ہفتہ میں ایک دن اُن کے مہم میں محفل شعر ہوتی۔ صبح ہم (خواجہ بہار الدین، عباس ہاشمی، ڈاکٹر منیر الزماں منیر، شکیل احمد، محمد قمر الدین صابری، کشپا کرآن وغیرہ) اُن کے روم میں جمع ہوتے۔ چائے نوشی ہوتی۔ کمرہ بند کیا جاتا۔ پھر اسی کو ہدایت دی جاتی کہ

نصف گھنٹہ تک کسی کو اندر آنے کی اجازت نہ دی جائے۔ یہ سلسلہ کئی ماہ تک چلتا رہا۔ ان کے ماتحت ایک سکشن آفیسر (جو ایک نو مشق شاعر تھے) کی یہ خواہش تھی کہ ان کا جشن منایا جائے۔ ہم نے شرارتاً حامی بھر لی اور ان سے ابتدائی تیاریوں کے لئے کچھ روپے لے لئے، مختلف عنوانات کے تحت روپیہ خرچ کئے جاتے رہے لیکن ان کا جشن نہیں منایا گیا۔ جشن کمیٹی کا سکریٹری عباس ہاشمی صاحب کو بنایا گیا تھا (جو اب بحیفہ صلع عادل آباد میں محشر بلدیہ ہے)۔ وہ اپنے طریقہ سے کبھی مٹھائی منگو کر اور کبھی چائے نوشی پر جشن کے ابتدائی اخراجات کیا کرتے تھے۔ دراصل ہم سبھوں نے ایک سنجیدہ مذاق کیا تھا۔ صادق احمد صاحب ایک اچھے ادیب ہیں۔ روزنامہ سیاست میں مختلف موضوعات پر ان کی تحریریں شائع ہوتی رہتی ہیں۔

صادق احمد صاحب کے زمانے میں بھی سکریٹریٹ اردو اسوسی ایشن کے بعض خاص خاص فنکشن ہوئے۔ صادق صاحب نے بھی اردو اسوسی ایشن کو پروان چڑھانے میں پُر خلوص تعاون کیا۔



سید تراب الحسن آئی۔ اے۔ ایس

جناب سید تراب الحسن سے میری پہلی ملاقات جگتیاں کے ایک محل ہند مشاعرہ میں ہوئی جس کے وہ روح رواں تھے۔ تراب الحسن صاحب اس زمانے

میں تعلقہ بنگتیاں پر اڈ منسٹر پیڑ سری رام پر ایکٹ کی حیثیت سے کام کر رہے تھے اس مشاعرہ میں بیکل آتساہی نے بھی شرکت کی تھی۔ حیدر آباد سے ہم تمام شاعر بذریعہ موٹر کار مشاعرہ میں شرکت کے لئے روانہ ہوئے تھے۔ بنگتیاں سے ۸-۱۰ میل پہلے ہمارے موٹر خراب ہو گئی۔ مشاعرہ کا وقت قریب آ رہا تھا، کسی ایک سولہوی کا مسئلہ پیش تھا۔ آخر کار ایک ایسی لاری ہمیں مل گئی جس میں سے کچھ دیہیہ ہی کو ٹوٹا آتا رہا تھا۔ لاری میں کونٹے کے ریزے بکھرے پڑے تھے، اس کے باوجود ہمیں اس لاری میں سفر کرنا پڑا۔ (شاعروں کو کبھی کبھی ایسے حالات سے بھی گزرنا پڑتا ہے) اس مشاعرہ کی صدارت مسٹر بی۔ ایم۔ رامن آئی اے ایس نے کی تھی، جو بعد میں چیف سکریٹری کے عہدہ پر فائز رہے۔ تراب الحسن صاحب ایک حرکیاتی شخص کا نام ہے، تہایت معتبر، ہمدرد، دوست قسم کے انسان ہیں۔ قلندر مزاجی ان کا ایک اہم وصف ہے۔ جب صادق احمد صاحب کو وظیفہ ہو گیا تو تراب الحسن اڈیشنل اگر پیکچر پروڈکشن کمشنر کو سکریٹریٹ اردو اسوسی ایشن کا صدر بنایا گیا۔ آج بھی وہ صدر ہیں۔ اسوسی ایشن کی مرگرمیوں کو پروان چڑھانے کے سلسلے میں مجھے تراب الحسن صاحب سے ہمیشہ اعانت حاصل رہا کرتی ہے۔ ہر ضرورت مند پریشان لازمین کی مدد کرتا ان کا وسیعہ تھا۔

سعادت علی نامی ایک صاحب جو کسی حکمہ میں یو۔ ڈی۔ سی تھے، کا تبادلو کسی ضلع پر ہو گیا تھا، وہ چند ناگزیر وجوہات کی بناء پر کسی صورت میں بھی جانا نہیں چاہتے تھے، ان کا بیان تھا کہ ان کی والدہ بیمار ہیں۔ وہ انہیں چھوڑ کر ضلع پر نہیں جاسکتے۔ مجھ سے کہنے لگے، آپ چاہیں تو میرا تبادلہ منسوخ

ہو سکتا ہے۔ میں نے آپ کے بارے میں سنا ہے کہ آپ انسانی ہمدردی کی بنیاد پر بے لوث خدمات انجام دیا کرتے ہیں۔ میں نے اُس شخص کی ساری باتیں سُنیں، اُس کو ہم دیدہ دیکھ کر ایک چمٹھی تراب الحن صاحب کے نام لکھ دی اور قون پر اُس پریشان حال شخص کی مدد کرنے کی خواہش کی۔ چند دنوں کے بعد وہ صاحب مٹھائی کا ڈیرہ لے کر میرے ہاں سکریٹریٹ آئے۔ میں نے دیکھا کہ اس وقت ان کی آنکھوں میں اظہارِ تشکر کے آنسو تھے۔



رمن راؤ آئی۔ اے۔ ایس

اپنی مختلف خوبیوں اور عمدہ خصوصیات کا بتاؤ پر مسٹر رمن راؤ بھی سکریٹریٹ کے اعلیٰ عہدہ دار کی حیثیت سے یاد رکھے جائیں گے۔ رمن راؤ صاحب کئی برسوں تک سکریٹریٹ اُردو اسوسی ایشن کے نائب صدر رہے۔ اُردو زبان سے اچھی طرح واقف ہیں، اُردو لکھنا پڑھنا جانتے ہیں۔ شعر و ادب سے کافی دلچسپی رکھتے ہیں۔ سکریٹریٹ کے بیڑیائی پروگرامس میں حصہ لیتے رہے ہیں۔ سکریٹریٹ اُردو اسوسی ایشن کے مختلف پروگرامس کے سلسلہ میں اُن کی مشاورت کو بھی اہمیت حاصل رہی ہے۔ صنعتی نمائش کے موقع پر گذشتہ ۱۲ سالہ سے نمائش کلب میں سکریٹریٹ اُردو اسوسی ایشن کے میوزیکل پروگرامس ہوتے

تعلقانہ ملازمین کی اچھی خاصی تعداد تھی۔ خواجہ صاحب سے پہلی اور بعد کی ملاقاتوں کے دوران میں نے محسوس کیا کہ وہ نہایت فرض شناس، دیانت دار، ہمدرد انسان ہیں۔ خواجہ صاحب سے میری ملاقات کم کم ہی رہتی تھی، چونکہ میں ان کا بالراست ماتحت نہیں تھا۔

اکثر اوقات گزٹ پیڈ آفیسر کے دستخط کھ

ضرورت معاشرہ میں گزٹنگز لوگوں کے علاوہ خاص طور پر کالجس کے طلباء کے فارمس پر بطور تصدیقی پیش آتی رہی ہے۔ میں نے خواجہ صاحب سے بے شمار طلباء اور اہل غرض اصحاب کے لئے تعاون حاصل کیا ہے۔ خواجہ صاحب نے کبھی بھی تصدیقی کے لئے تامل نہیں کیا۔ ان کا اپنا ایک طریقہ کار تھا کہ بسم اللہ الرحمن الرحیم پڑھ کر ہر متعلقہ قسم پر اور ہر متعلقہ سرٹیفکیٹ پر دستخط کیا کرتے تھے۔ ایک دن میں نے پوچھا کہ آپ فارمس پر بلا تامل دستخط کیا کرتے ہیں، آپ جاننا بھی نہیں چاہتے کہ متعلقہ شخص کون ہے، فارمس اور سرٹیفکیٹس کس کے ہیں، صحیح ہیں کہ نہیں۔ خواجہ صاحب نے جواب دیا کہ میں اللہ کا نام لے کر کام کرتا ہوں۔ صحیح یا غلط کے بارے میں نہیں سوچتا، بسم اللہ الرحمن الرحیم پڑھ کر کام شروع کرنے کے بعد ہر مشکل آسان ہو جاتی ہے۔ ویسے بھی جتنی بھی نیکیاں ممکن ہوں کر لیتی چاہیئے۔ خواجہ صاحب نہایت سیدھے سادے خدا ترس آفیسر کی طرح یاد کئے جاتے رہیں گے۔ ہمیشہ شیر والی پہنتے ہوئے سر پر رونی ڈوٹی، ایک دھن دار شخص کی طرح اپنی انفرادیت کو باقی رکھا کرتے تھے۔ انہوں نے کبھی بھی اعلیٰ عہدہ داروں سے نظریں جھکا کر بات نہیں کی۔

خواجہ صاحب کا سلوک اپنے ماتحتین سے دوستانہ تھا۔ تمام ماتحت اُن سے مکمل تعاون کیا کرتے تھے۔ ان کی انسان دوستی کا صرف ایک واقعہ بیان کرنا چاہتا ہوں (یہ بات مجھے میرے ساتھی خواجہ بہاء الدین) نے بتائی پہلے تاریخ تھی، خواجہ صاحب تنخواہ لے چکے تھے۔ کسی یتیم خانہ کے کچھ سربراہ ان کے ہاں آئے، وہ ان کی باتوں سے کچھ اس قدر متاثر ہوئے کہ انہوں نے اپنی ساری تنخواہ اُن کے حوالے کر دی۔



عبدالمحمود

اسٹنٹ سکریٹری

جناب عبدالمحمود سے سکریٹریٹ میں میری کبھی کھل کر گفتگو نہیں ہوئی البتہ اُن سے ایک سرسری ملاقات کا خیال آتا ہے، شاید میں یہ پہلی دفعہ ان سے ایک سرٹیفکیٹ پر دستخط لینے کے لئے ملا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ وہ محکمہ تعلیمات میں اسٹنٹ سکریٹری تھے، پھر وہ ۱۹۷۷ء میں آصفیہ لائبریری کے ڈائریکٹر بن کر کچھ عرصہ وہاں کام کرنے کے بعد نظامس ٹرسٹ سے وابستہ ہو گئے اور اب وہ کمی برسوں سے سکریٹری نظامس اردو ٹرسٹ کی حیثیت سے خدمات انجام دے رہے ہیں۔ محمود صاحب کو سکریٹریٹ اردو اسوسی ایشن لی سرگرمیوں سے دلچسپی لینے کا موقع ہی نہیں ملا۔ اگر وہ کچھ اہمیت کے لئے

سکریٹریٹ میں رہتے تو ان کی خدمات سے بھی استفادہ کیا جاسکتا تھا۔
 نظامِ اردو ٹرسٹ کی جانب سے اُردو کی اچھی اور معیاری کتابوں
 کی اشاعت کے لئے جزوی طور پر وقتی اعانت کی جاتی ہے۔ میری سفارش کی
 پذیرائی کرتے ہوئے انہوں نے بہت سے مستحق اہل قلم کی کتابوں کی اشاعت
 کے لئے فراخ دلی کے ساتھ امداد دی ہے۔ خود میں نے بھی یہ محسوس کیا ہے کہ نمود
 کی اشاعت کے لئے تعاون حاصل کیا ہے۔ میں نے بھی یہ محسوس کیا ہے کہ نمود
 صاحب شریف النفس انسان ہیں، شائستگی اور نفاست اُن کی طبیعت کا خاصہ
 ہے۔ مسکراتے ہوئے شگفتہ اور پُر اثر لب و لہجہ میں اپنی بات منوانے کا
 سلیقہ ہے۔ نہایت نفیس، خوش مزاج اور متوازن اندازِ فکر رکھنے والی شخصیت،
 کے مالک ہیں۔ مخلصانہ روابط کی پاسداری میں وہ کافی فیاض واقع ہوئے ہیں۔
 کسی ایسے مسئلہ پر جو اُن سے تعاون کا طلب گار رہتا ہے، تو بہرِ دلالت ہوں تو
 مجھے مایوسی نہیں ہوتی۔ مزاج کی شائستگی کا ہی یہ فیضان ہے شاید کہ
 وہ ادبی و علمی حلقوں میں محترم سمجھے جاتے ہیں۔



مبشر احمد

جوائنٹ سکریٹری

مبشر احمد صاحب اُردو کے ایک اچھے ادیب و نقاد ہیں جو جوائنٹ

سکریٹری فنانس ایڈ پائنگ ڈپارٹمنٹ کی حیثیت سے ریٹائر ہو چکے ہیں اور ان دنوں پرنسپس امری ہاسپٹل میں ایڈ منسٹریٹر کی خدمت پر مامور ہیں۔ مبشر احمد صاحب کچھ عرصوں کے لئے میرے محکمہ پنجایت راج میں اسسٹنٹ سکریٹری رہ چکے ہیں۔ سکریٹریٹ میں ان کے دوست و احباب کا حلقہ بہت وسیع تھا۔ نہایت منسار، خوش اخلاق، ہمدرد، مخلص، دوست نواز آفیسر تھے۔ ہر مستحق شخص کی مدد کرنا گویا ان کی ذمہ داری میں داخل تھا۔ مبشر احمد صاحب سے میرے بہت اچھے مراسم تھے، آج بھی میں اُن کی اسی طرح عزت کرتا ہوں۔ جس طرح میں سکریٹریٹ کی ملازمت کے دنوں میں کیا کرتا تھا۔

یوں تو میں نے مبشر احمد صاحب کی عنایتوں سے بہت سے مستحق طلبہ اور اہل غرضات کی مدد کی ہے لیکن ایک اہم کام کے سلسلے میں انہوں نے جو سیری اعانت کی تھی، وہ ناقابل فراموش ہے۔ اُن دنوں میرے ایک دوست کی بہنیں و کمینس کالج (کوٹھی) میں پڑھا کرتی تھیں۔ اُن لڑکیوں کے دو بھائی سرکاری ملازم تھے اور اتفاق سے دونوں اضلاع پر تھے۔ گھر میں ان لڑکیوں کے سوا اُن کی ماں اور ایک ملازمہ رہتی تھی۔ ایک دن مجھ سے کہا گیا کہ بچیاں جب بھی کالج کے لئے گھر سے نکلتی ہیں اور لوٹتی ہیں تو پڑوسی کا لڑکا جھلے کتا رہتا ہے اور انہیں دیکھ کر گھٹیا قسم کے فلمی گانے گاتا ہے۔ میں نے سن کر کہا کہ اس کا انتظام ہو جائے گا۔ یہ بات میں نے مبشر احمد صاحب سے بھی (جبکہ وہ میرے محکمہ میں اسسٹنٹ سکریٹری تھے)۔ چونکہ اُن کے ایک بہنوئی خواجہ الطاف احمد اسسٹنٹ کمشنر کرائم برانچ (کنٹرول روم)

تھے۔ ایک دن میں، مبشر احمد صاحب اور اُن کے ہوم ڈیپارٹمنٹ سے تعلق رکھنے والے ایک ساتھی جناب امیر علی صاحب کے ساتھ الطاف صاحب کے آفس پہنچا۔ اُن بے ساری باتیں کہہ دیں۔ الطاف احمد صاحب نے فوری متعلقہ اینٹا کو بلوایا، ساری تفصیلات بتلائیں۔ اُسی رات ۱۲ بجے کے بعد اُس لڑکے کو پکڑ کر لے گئے اور حوالات میں بند رکھا۔ تمام رات اُس کی خوب پٹائی کی۔ دوسرے دن سخت وارننگ دے کر اُس لڑکے کو چھوڑ دیا گیا۔ اس واقعہ کے بعد اُس لڑکے نے دوبارہ سر نہیں اٹھایا۔ اس دوستانہ تعاون کے لئے میں آج بھی مبشر احمد صاحب سے ممنونیت کا اظہار کرتا ہوں۔

وقت گزر جاتا ہے لیکن ایسے محسنین کو بھلایا نہیں جاسکتا جو نازک مواقع پر کبھی ضرورت مندوں کی مدد کرتے ہیں۔



رشید قریشی

جوائنٹ سکریٹری

رشید قریشی صاحب کو میں ایک ادیب، ڈرامہ نگار اور طنز و مزاح نگار کی حیثیت سے جانتا تھا۔ وہ اسسٹنٹ سکریٹری کی حیثیت سے پنجابیت راج ڈیپارٹمنٹ میں کچھ جینے رہے۔ پہلے وہ ایجوکیشن ڈیپارٹمنٹ میں اسسٹنٹ

امتحان دے کر نتیجہ کا انتظار کر رہے تھے۔ اُن دنوں ڈاکٹر صادق نقوی اُن کے قریب ترین دوستوں میں سے ایک تھے، جنہوں نے سعد حسین سعد سے میرا تعارف کروایا تھا۔ سعد حسین سعد مدینہ پھول میں تنہا ایک انگ گوش میں بیٹھا کھاتے تھے، بلا کے سگریٹ نوش تھے۔ ویسے بھی اُن دنوں چارمینار سگریٹ پیٹا دانشوروں اور بے روزگار نوجوانوں کی علامت سمجھی جاتی تھی۔ ایک وقت آیا کہ وہ ٹریننگ کے دوران دیپور (ویسٹ بنگالہ) پر ڈپٹی کلکٹر کی حیثیت سے مامور ہوئے۔

سعد حسین سعد ابتدائی ملازمت کے بعد بھی سکرپٹریٹ میں کچھ زیادہ دنوں کے لئے نہیں رہے۔ لیکن جب بھی وہ سکرپٹریٹ میں رہے۔ سکرپٹریٹ اُردو اسوسی ایشن کے شرعی و ادبی ریڈیائی پروگرامس میں حصہ لیتے رہے، اُن دنوں انہیں نائب صدر اسوسی ایشن نامزد کیا گیا۔ سعد حسین سعد سے میرا تعلق کبھی بھی ماتحت اور آفیسر کا نہیں رہا، انہوں نے میرے محکمہ میں کبھی بھی کام نہیں کیا۔ ہمارے ہمیشہ دوستانہ انداز کے رہے (اب بھی ہیں)۔ میں نے بہت سے تعلیم یافتہ نوجوانوں اور ضرورت مند اصحاب کے پاسپورٹ فارمس اور مختلف نوعیت کے سرٹیفکیٹس پر بطور تصدیقی سعد حسین صاحب سے دستخط کے لئے تعاون حاصل کیا ہے۔ انہوں نے میری کسی بھی سفارش کو نظر انداز نہیں کیا۔ نہایت شریف النفس، غفار، خوش مزاج اور نرم گفتار انسان ہیں۔ متین، سنجیدہ۔ دیانت دار اور معتبر اعلیٰ آفیسر کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں۔

سعد حسین سعد ایک اچھے شاعر بھی ہیں، جو مشاعروں کی ہنگامہ آرائیوں سے دور دور رہتے ہیں لیکن ان بعض خاص خاص مشاعروں میں بااصرار انہیں جو عزت رہتا ہوں۔ اُن کے قریبی دوستوں میں ممتاز میوزیشن خواجہ بہار الدین بھی ہیں، جو اُن کا بھرم ٹیلی ویژن اور آل انڈیا ریڈیو کے علاوہ مختلف تہذیبی پروگرامس میں پیش کرتے ہیں۔ سعد حسین سعد، سکریٹریٹ میں ایڈیشنل سکریٹری محکمہ ونیس ڈیولپمنٹ پائلڈ ویلفیئر اینڈ لیبر تھے لیکن اب وہ اپیشل آفیسر قح بورڈ کی حیثیت سے کام کر رہے ہیں۔



غلام دستگیر قریشی (آئی۔ اے۔ ایس)

سکریٹریٹ کے مقبول ترین، پسندیدہ اور بہتر د اعلیٰ افسروں کا جہاں ہمیں تذکرہ ہوگا، وہاں لازماً غلام دستگیر قریشی صاحب کا بھی ذکر آئے گا۔ سکریٹریٹ میں بعض ایسے نفیس اور بامروت اعلیٰ آفیسر بھی رہے ہیں جن سے گفتگو کرتے ہوئے بے حد خوشی محسوس ہوتی تھی۔ جناب نریندر لوتھر اور ڈاکٹر حسن الدین احمد کی طرح قریشی صاحب بھی سکریٹریٹ میں بہت کم رہے۔ قریشی صاحب سے میری پہلی ملاقات دکنی زبان کے ممتاز شاعر سلیمان خلیفہ کے ہمراہ اُس وقت ہوئی جب وہ اُن سے ملنے کے لئے سکریٹریٹ آئے تھے۔ خلیفہ صاحب پہلے میرے سکشن آئے اور اہم کر کے اپنے ہمراہ قریشی صاحب کے

نیاس لے گئے۔ اُن دنوں قریشی صاحب سکریٹری ریونیو ڈپارٹمنٹ و کمشنر محکمہ بازار آباد کاری تھے۔ خطیب صاحب نے پلہ اسے کے ذریعہ اپنا سارڈ بھجوا دیا۔ قریشی صاحب دروازہ تک آئے اور اجلاس پر اپنے ساتھ لے گئے۔ انھوں نے ہم دونوں کی مشروبات سے آواضع کی۔ خطیب صاحب کی یہ عادت تھی کہ جب بھگوان حیدر آباد آتے تو اپنے دوستوں اور شاگردوں کی تلاش میں نکل جاتے۔ انہیں قریشی صاحب سے کوئی خاص کام نہیں تھا، صرف ان سے ملنا مقصود تھا۔

قریشی صاحب سے میری دوسری ملاقات علیہ اسکول کی گولڈن جوبلی تقریب کے موقع پر ہوئی۔ مشاعرہ میں اسکول کے اولڈ بوائز کی حیثیت سے غلام احمد صاحب کرکٹر اور قریشی صاحب نے بھی کام سنایا تھا۔ اس مشاعرہ کے بعد اُن سے مختلف محفلوں میں ملاقاتیں رہیں۔ قریشی صاحب میری شاعری کے پسندیدار ہیں، جب بھی ملتے ہیں تو وہ میرے اشعار فرورسنا دیتے ہیں جو میں نے ڈاکٹر نایلم سنجواریڈی کی زیرِ تقدیمی تقریب میں سنائے تھے۔

(ڈاکٹر نایلم سنجواریڈی) جب صدر جمہوریہ ہند کے جلیل القدر عہدہ پر فائز ہوئے تو شہرِ راجستھان حیدر آباد و سکندر آباد کی جانب سے پبلک گارڈن میں فقیہ المثل غیر متقدمی جلسہ عام کا انعقاد عمل میں لایا گیا تھا۔ روابط کے تسلسل اور مراسم کی تجدید کے لئے قریشی صاحب کو بعض ادبی محفلوں میں شرکت کی دعوت دیا کرتا ہوں۔ سلجھے ہوئے اور شگفتہ لب و لہجہ سے آراستہ جب ایسی شخصیتوں سے ملاقات ہوتی ہے تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ شہر کی تمام فائزہ شخصیتوں سے بڑیک ملاقات ہو رہی ہے۔

نریندر لوتھر آئی۔ اے۔ ایس

آج سے تقریباً (۳۰) برس پہلے نریندر لوتھر صاحب سے میں اس وقت روشناس ہوا جب پروفیسر عبدالقادر مدنی کی رہائش گاہ (حیدر گڑھ) میں ایک پرتکلف عصرانہ ترتیب دیا گیا تھا جس کے فوری بعد محفل شعر کا انعقاد محل میں نایا جانے والا تھا۔ اس محفل میں مجھے لوتھر صاحب کی پہلی تصنیف 'بند کوڑا' کا رسم اہرام تقریب کا دعوت نامہ ملا تھا۔ یہ دعوت نامہ کتابوں کے سرورق کی طرح تھا (جو میرے ہاں اب بھی محفوظ ہے)۔ اس کے بعد لوتھر صاحب سے مختلف جلسوں اور مشاعروں میں ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ زندہ دلائل حیدر آباد سے میری دوستی کے بعد لوتھر صاحب سے ملتے کا موقع بار بار ملتا رہا۔ لوتھر صاحب سکریٹریٹ میں بہت کم عرصہ کے لئے رہے، اس لئے سکریٹریٹ اردو اسوسی ایشن ان کی خدمات سے استفادہ نہ کر سکی۔

لوتھر صاحب نہایت اصول پسند ڈسپلن کے پابند اعلیٰ آفیسر رہے ہیں۔ حق بات کے معاملے میں وہ انتہائی عمتاط رویہ اختیار کرتے رہے۔ جس حکمران بھی لوتھر صاحب کا گزار رہے، وہاں انہوں نے اپنی ہر دل عزیزی اور اعلیٰ آفیسری کے گہرے نقوش چھوڑے ہیں۔ چاہے وہ ڈائریکٹوریٹ انڈسٹریز ہو کہ ڈائریکٹریٹ محکمہ اطلاعات عامہ، چاہے وہ نیوسپل کارپوریشن ہو کہ میٹروپولیٹن ڈیپارٹمنٹ (سکریٹریٹ) یا کوئی اور آفس ہو، وہ اپنی نفاست

نہایت اور اپنی صلاحیت کا لوہا منوا چکے ہیں۔

لو تھر صاحب ریٹائر ہوئے سے کچھ دن قبل چیف سکریٹری کے اعلیٰ عہدہ پر بھی فائزر رہے جنھوں نے چیف سکریٹری کے عہدہ کو شایان شان طریقہ پر نبھاتے ہوئے حکومت کے بعض اہم پروجنکٹس کی صورت گیری کے لئے نمایاں کام انجام دیا ہے۔ جس طرح وہ صف اول کے طنز و مزاح نگار کی حیثیت سے شہرت رکھتے ہیں، اسی طرح وہ اپنی ساری مدت ملازمت، باوقار، باصلاحیت اور قابل ترین اعلیٰ آفیسر کی حیثیت سے گزاری ہے۔ لو تھر صاحب ایک اعلیٰ درجہ کے آفیسر ہوتے ہوئے بھی شاعروں اور ادیبوں سے انتہائی سادگی اور روابط کی پاسداری کو محسوس کرتے ہوئے ملتے ہیں۔ یقیناً لو تھر صاحب نے اپنی تمام مدت ملازمت کے دوران بہت سے مستحق ملازمین کے ساتھ انصاف کیا ہوگا۔ بہت سے دوست احباب کے لئے سفارشی سنی ہوں گی۔ سفارشی کی ہوں گی۔ لو تھر صاحب نے ایک جنبش قلم کے میرے ایک ڈاکٹر دوست کے ساتھ بھی انصاف کیا۔ ایک دن یوں ہوا کہ ہندی کے ممتاز شاعر اوم پرکاش تریل اپنے ایک ڈاکٹر دوست مسٹر وی۔ پی۔ سنگھی کو ہمراہ لے کر میرے سکشن میں آئے، پچائے خوشی کے بعد مجھ سے کہا اتفاق سے لو تھر صاحب میڈیکل ایڈیٹریل ڈیپارٹمنٹ کے سکریٹری ہیں، ان سے کام لینا ہے۔ میرے یہ ڈاکٹر دوست تقریباً ۱۰ سال سے رخصت پر ہیں۔ ان کا تبادلہ حیدر آباد پر ہونا بے حد ضروری ہے، چونکہ ان کے حالات کچھ ایسے ہیں کہ ان کا شہر میں رہنا ضروری ہے۔ ہم دونوں ایک دن لو تھر صاحب سے ان کے اجلاس پر ملے۔ لو تھر صاحب نے

ہماری ساری باتیں سنیں لیکن کوئی تشفی بخش جواب نہیں دیا۔ البتہ اتنا ضرور کہا کہ اگر اصول طور پر اعانت ممکن ہو تو میں ضرور مدد کروں گا۔ (مختلط رویہ) کی یہ ایک معمولی سی مثال ہے) لیکن ہمیں یقین تھا کہ یہ ہماری سفارش کو رد نہیں کریں گے۔ کچھ دن گزرنے کے بعد ڈاکٹر سنگھی کا حیدر آباد پر تبادلہ ہو گیا۔ ہم دونوں ڈاکٹر سنگھی کو اپنے ہمراہ لے کر انچارج شکر کے لئے لو تھر صاحب کے اجلاس پر پہنچے۔ لو تھر صاحب نے کہا کہ شکر کی کوئی بات نہیں ہے۔ ہر جائز کام میں اعانت کرتے ہوئے مجھے خوشی ہوتی ہے۔ میں نے اٹھتے ہوئے کہا کہ بعض اعلیٰ عہدہ دار ایسے سمجھوتے میں جو اپنی بے پایاں کرم فرمائوں کے باوجود بھی اپنی نیکیوں کا حساب نہیں رکھتے، ایسے ہی عہدہ داروں میں سے ایک آپ بھی ہیں۔



ڈاکٹر حسن الدین احمد آئی اے ایس

ڈاکٹر حسن الدین احمد مختصر عرصہ کے لئے سکریٹریٹ میں رہے۔ ان کی ملازمت کا زیادہ حصہ نان سکریٹریٹ، سرکس اور مرکزی حکومت کے دفاتر میں گذرا۔ کئی برس سے میں ان کی علمی و ادبی سرگرمیوں سے واقف ہوں۔ انہوں نے دورانِ ملازمت اپنی علمی و ادبی معروضات کو جاری رکھتے ہوئے کئی

کت میں تصنیف و تالیف کی ہیں۔ وظیفہ حسن خدمت کے بعد انہوں نے انگریزی
 نفلوں کے اردو نظام ترجموں کا تنقیدی اور تحقیقی مطالعہ کے موضوع پر ڈاکٹریٹ کی ڈگری لی۔
 ڈاکٹر حسن الدین احمد جب سکریٹریٹ کے حکمران فارسٹ، اینبل ہسپتالری میں
 جوائنٹ سکریٹری کی حیثیت سے مامور ہوئے تو مجھے اُن سے ملنے کا اشتیاق
 پیدا ہوا۔ شخصی حیثیت سے بھی اور سکریٹری سکریٹریٹ اے او ایس ایشن کی
 حیثیت سے بھی اُن کے ملنے کا ضروری سمجھا۔ میں سکریٹریٹ اے او ایس ایشن
 کی سرگرمیوں کے سلسلے میں اُن سے استفادہ حاصل کرنا ہی چاہ رہا تھا کہ
 موصوف کا تبادلہ ہو گیا اور وہ واپس چلے گئے۔

ڈاکٹر حسن الدین احمد بہت کم مدت کے لئے سکریٹریٹ میں رہے۔
 اُن کے ماتحتین سے مجھے ملنے کا اتفاق ہوتا تھا جو اُن کے حسن سلوک کے
 مداح تھے۔ خوش مزاجی، کم گوئی، حسن الدین احمد صاحب کے مزاج کا خاصہ ہے
 مزاج کے وہ بذلہ سنج واقع ہوئے ہیں۔ بات میں بات پیدا کرنا ان کا محبوب
 مشغلہ ہے۔ کاشع وہ بہت پہلے سکریٹریٹ میں آئے ہوتے۔ ایسی صورت
 میں سکریٹریٹ اے او ایس ایشن کے لئے اُن کی خدمات و مشاورت سے استفادہ
 حاصل کیا جاسکتا تھا۔ میں مختلف مواقع پر سکریٹریٹ کے اعلیٰ
 عہدہ داروں سے ملازمین سکریٹریٹ کی کاروائیوں اور اہل غرض حضرات کے کاموں
 کے لئے تعاون حاصل کیا کرتا تھا۔ حسن الدین احمد صاحب سے ایسا موقع مجھے نہ
 مل سکا۔ سکریٹریٹ کے اعلیٰ عہدہ دار جنہوں نے دورانِ ملازمت اپنی اعلیٰ
 وادبی سرگرمیوں اور اپنے تصنیف و تالیف کے کام کو جاری رکھا اُن میں

بھارت چند کھڈے ، نریندر لوتھر ، رشید قریشی ، سعد حسین سعد کے علاوہ
ڈاکٹر حسن الدین احمد بھی شامل ہیں۔

ڈاکٹر حسن الدین احمد سے میرے شخصی مراسم ہیں۔ علمی و ادبی محفلوں میں
انہیں اظہارِ خیال کے لئے زحمت دیا کرتا ہوں۔ صدر نشین اقلیتی کمیشن ہونے
کے بعد بھی وہ اپنی برادری (شاعروں و اداویوں) سے ملنے میں قطعی تکلف نہیں
کرتے۔ حسن الدین احمد صاحب سے ملاقات کے بعد یوں محسوس ہوتا ہے کہ ان
میں نہ صرف حیدر آبادی تہذیب کا تسلسل باقی ہے بلکہ ان کے پیروں پر غلو
میں ان کے اسلاف کی خوشبو بھی شامل ہے۔



خالد انصاری آئی اے ایس

جناب خالد انصاری سے ، ایک وضع دار ، مہذب اور شائستہ مزاج
شخص کی حیثیت سے میرا تعارف ہوا۔ جناب مبشر احمد جو انٹل سکریٹری
فیتنس ڈیپارٹمنٹ اکثر ان کا ذکر کرتے ہوئے مجھے مشورہ دیتے تھے کہ
سکریٹریٹ اُردو اسوسی ایشن کے پروگرامس میں ان کی صلاحیتوں سے بھی
استفادہ کیا جاتا رہے تو بہتر ہے لیکن جب کبھی میں انہیں پروگرامس میں
حصہ لینے کے لئے زحمت دینا چاہا وہ اپنی مصروفیات کی وجہ سے اس موقف

میں نہیں رہے کہ حصہ لے سکیں۔

ایک دن میں ان کے اجلاس پر پہنچا جبکہ وہ محکمہ لیسٹریٹ ایڈمنسٹریشن کے پرنسپل سکریٹری تھے۔ بڑے پرتپاک انداز سے مصافحہ کرنے کے بعد کہا کہ قمر شریف رکھئے۔ تقریباً نصف گھنٹہ تک اُردو کے مسائل اور اُردو شعر و ادب پر گفتگو رہی۔ دورانِ گفتگو اندازہ ہوا کہ مختلف علوم و فنون پر ان کی گہری نظر ہے۔ ان کے بارے میں میرا یہ تاثر ہے کہ قائدِ اُردو ان کا اصلی جوہر ہے۔ نہایت صداقت پسند اور بے باک انسان ہیں۔ ایسا تاثر لے کر میں ان کے اجلاس سے اُٹھا۔ خالد انصاری صاحب اگرچہ شیر و افغانی زیب تن کئے ہوئے ہوتے تھے لیکن ان کی شیر و افغانی کے تمام ٹین ہمیشہ کھلے رہتے۔ وہ اپنی ایک خاص وضع داری پر قائم رہے۔

خالد انصاری صاحب کا انداز ہی الگ تھا، انہوں نے کبھی بھی اپنے طرزِ حیات کو نہیں بدلا۔ ایک وضع دار اور پُر وقار شخصیت کی حیثیت سے سارے سکریٹریٹ پر چھائے ہوئے تھے۔ انہوں نے اپنی اصول پسندی کو کسی بھی مرحلے پر قربان ہونے نہیں دیا۔ بے نیاز، قلتِ درانہ طبیعت کے مالک تھے۔ اپنے ایک خاص رنگ میں ڈوبے ہوئے، اپنی انفرادیت کو ہاتھی رکھتے ہوئے، شاندار طریقہ سے وظیفہ حسنِ خدمت تک سکریٹریٹ کے وقار میں اضافہ کرتے رہے۔



اے۔ کے۔ گونل آئی۔ اے۔ ایس

سکریٹریٹ میں جواں سال نئے آئی۔ اے۔ ایس عہدہ دار جو مختلف اوقات میں آتے رہے، اُن میں مسٹر اے کے گونل کو بھی یاد رکھایا جائے گا۔ اس اعتبار سے بھی کہ وہ نہ صرف ایک فرض شناس عہدہ دار تھے بلکہ وہ ایک انسانیت دوست، مروت شناس اور ہمدرد انسان بھی تھے۔

مسٹر اے۔ کے۔ گونل سے میری پہلی ملاقات (۱۰) سال پہلے ورنگل کے ایک قومی یکجہتی مشاعرہ میں ہوئی تھی، جس کی انہوں نے صدارت کی تھی، مشاعرہ میں کلام سنایا تھا اور پُر اثر تقریر بھی کی تھی۔ مشاعرہ کا اہتمام جناب جلیل امرت نے کیا تھا۔ گونل صاحب کو شعر و ادب سے کافی لگاؤ ہے۔ ان کے اسلاف کا تعلق اُتر پردیش سے ہے۔ گونل صاحب نے کلکٹر ورنگل کی چیتیت بے کافی شہرت حاصل کی ہے۔ اُن سے میری دوسری ملاقات سکریٹریٹ میں ہوئی۔ جیسے ہی انہوں نے مجھے دیکھا بے ساختہ بغل گیر ہوئے اور کھل کر ہنستے ہوئے کہا کہ

کون قاتل ہے یہاں اپنے رفیقوں کے سوا

سب بھلے لوگ ہیں کس کس کو سزا دی جائے

گونل صاحب نے کہا کہ میں اپنے عکس کے مختلف کیسیس میں فیصلہ کرنے کے لئے آپ کے شعر سے مدد لیتا ہوں۔ میں نے مشاعرہ قومی یکجہتی کے موضوع پر کچھ شعر سناتے ہوئے یہ شعر بھی پڑھا تھا

مطلع تھا

کیا فروری ہے کہ شعلوں کو ہوا دی جائے

کیوں نہ اس شہر سے یہ رسم اٹھا دی جائے

جب گوئل صاحب جو انٹ سکریٹری میونسپل ایڈمنسٹریشن کی پیشہ سے

سکریٹریٹ جوائن کئے تو ان سے وقتاً فوقتاً ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ نہایت

دوستانہ ماحول میں گفتگو کیا کرتے تھے اور ہر دو تین جلوں کے بعد نیر بھائی

ضرور پچھتے۔ گوئل صاحب کے ادنیٰ فوق کو محسوس کرتے ہوئے انہیں سکریٹریٹ

آرڈو اسوسی ایشن کے ریڈیائی پروگرامس میں حصہ لینے کی درخواست کرتا رہا۔

انہوں نے کئی ریڈیائی پروگراموں میں حصہ لیا ہے۔ گوئل صاحب ایک غلص، صاف گو

بے ریا انسان ہیں، جن سے ملنے کے بعد ہر شخص کی رگ و پے میں میری طرح

مسرے کی لہر دوڑ جاتی ہوگی۔ گوئل صاحب اگرچہ کہ اتر پردیش کے رہنے والے ہیں

لیکن انہوں نے حیدرآباد کو اپنا وطن بنا لیا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ سارے ملک

میں حیدرآباد ہی ایک ایسا محفوظ مقام ہے جہاں ہر شہری اپنی فیملی کے ساتھ

دبئی سکون سے رہ سکتا ہے۔



وینکٹ رمناپچاری آئی۔ اے۔ ایس

میں جناب وینکٹ رمناپچاری کی سماجی، فلاحی، تہذیبی اور سیکولر

سرگرمیوں سے اُس وقت سے واقف ہوں جبکہ وہ ایڈمنسٹریٹری قلمی شہ

اربن ڈیولپمنٹ اتھارٹی کی حیثیت سے خاص طور پر پُرانے شہر میں شہرت و مقبولیت حاصل کر چکے تھے۔ جب مجھے بعض پروگرامس کے سلسلے میں اُن کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملا تو میرے خیالات کی تصدیق ہو گئی۔ بہتر نہیں، انہیں کس نے مشورہ دیا تھا کہ مشاعروں اور تہذیبی پروگرامس کے سلسلے میں مجھ سے تعاون حاصل کیا کریں۔

مسٹر رمنا چاری، قلی قطب شاہ آڈیٹوریم کے افتتاح کے موقع پر تہذیبی پروگرام کے ساتھ ساتھ مشاعرہ بھی منعقد کرنا چاہتے تھے۔ ایک دن سکریٹری قلی قطب شاہ اربن ڈیولپمنٹ اتھارٹی جناب تاج الدین نے فون پر بتایا کہ رمنا چاری صاحب مجھ سے فون پر بات کرنا چاہتے ہیں اور وہ یہ چاہتے ہیں کہ قلی قطب شاہ آڈیٹوریم کی افتتاحی تقریب کے موقع پر ایک شاندار مشاعرہ کا اہتمام کریں۔ رمنا چاری صاحب سے فون پر گفتگو رہی۔ جناب عابد علی خاں مدیر سیاست کی صدارت میں شاندار پیمانے پر مشاعرہ منعقد ہوا، جس میں تقریباً (۳۰) شاعروں نے کلام سنایا تھا۔ اُن تمام مشاعروں کو قلی قطب شاہ اربن ڈیولپمنٹ اتھارٹی کی جانب سے شال اور صافی جاکر سنان کیا گیا۔

رمنا چاری صاحب سے میری دوسری ملاقات جشن گوکٹڈہ سوسائٹی کے نکل ہند مشاعرہ کے انتظامات کے سلسلے میں قلی قطب شاہ آڈیٹوریم میں ہوئی، اُس وقت جناب عابد علی خان صاحب، محبوب حسین بگڑ صاحب اور ڈاکٹر موہن لال نگم بھی موجود تھے۔ میں نے محسوس کیا کہ انہیں حیدر آباد کی تہذیب اور آدو زمان سے کافی دلچسپی ہے۔

جب رہنما جاری صاحب ڈپٹی سکریٹری میونسپل ایڈمنسٹریشن کی
 حیثیت سے سکریٹریٹ آئے تو ان سے ملاقاتوں کا سلسلہ پڑھنے لگا۔ اسی
 زمانے میں اولڈ سٹی یوتھ فیسٹول منعقد ہونے والا تھا۔ ڈاکٹر سی نارائن ریڈی
 وائس چانسلر تلگو یونیورسٹی کے مشورہ سے مجھے یوتھ فیسٹول کا سکریٹری نامزد
 کیا گیا۔ میں نے ان کے اعتماد کو برقرار رکھتے ہوئے شب غزل اور مشاعرہ کے
 انعقاد کی ذمہ داری قبول کی۔ جناب خواجہ بہار الدین اور جناب اسلم فرشتوری شیعہ
 اور تہذیبی پروگرام کے کنوینر بنائے گئے۔ سرزینپال سنگھ ورما اور رئیس اختر
 کنوینر مشاعرہ اور ڈاکٹر صادق نقوی سینار کے کنوینر مقرر ہوئے۔ مشاعرہ میں
 اردو ہندی کے زائد از (۳۵) شاعروں نے کلام سنایا تھا۔ ہر گنگا جمنی مشاعرہ نہایت
 کامیاب رہا۔ مشاعرہ میں شعراء کو مومنٹو پیش کئے گئے اور عمان کے طور پر شال
 اوڑھائی گئی۔ میں نے لسانی ہم آہنگی کا ثبوت دیتے ہوئے اردو شاعروں کو دعوت
 سخن دینے کے لئے زینپال سنگھ ورما کو اور ہندی شاعروں کو زحمت کلام
 دینے کے لئے رئیس اختر سے درخواست کی تھی۔ یہ گنگا جمنی مشاعرہ نہایت کامیاب
 رہا، مقصدی اعتبار سے بھی اور لسانی ہم آہنگی کے اعتبار سے بھی۔

مسٹر رہنما جاری اردو شعروادب کی سرگرمیوں اور تہذیبی پروگراموں
 کے انعقاد کے سلسلے میں مجھ سے مشورہ کیا کرتے ہیں۔ جب سے وہ ڈاکٹر لکھنوی
 امور بن گئے ہیں ان کی ذمہ داریوں میں اضافہ ہو گیا ہے۔ انہیں مجھ پر ان قدر
 اعتبار آگیا ہے کہ بعض پروگرامس میری ذمہ داری پر پہلے طے کرتے ہیں اور بعد
 میں مجھے اس کی اطلاع دیتے ہیں۔ ماہ مئی میں دلی میں محکمہ تہذیبی امور کی

جانب سے ایک پروگرام طے کیا گیا اور یہاں سے (۱۸) فنکاروں کو دلی بھیجا
 گیارہ پروگرام کے پنجارج جناب خواجہ بہار الدین تھے، اُن کی قیادت میں تمام
 فنکار دلی پہنچے اور شاندار و کامیاب پروگرام پیش کیا۔ اس پروگرام کی
 صورت گری میں جناب حمایت اللہ صاحب نے بھرپور تعاون کیا۔

رہنما چاری صاحب کی خواہش پر ادارہ "میرا شہر میرے لوگ" کے زیر اہتمام
 بہ تعاون محکمہ تہذیبی امور و محکمہ اطلاعات عامہ اعلیٰ پیمانے پر ماہ مئی ۱۹۹۱ء
 میں مال والا پبلیس میں اردو، ہندی کا ملا جلا قومی یک جہتی مشاعرہ منعقد کیا گیا۔
 اس مشاعرہ میں بھی شاعروں کا سہماں کیا جا کر شاعروں کو شمال اور ڈھائی گئی۔ اس
 مشاعرہ میں ۳۵ شاعروں نے کلام سُنا یا تھا۔

مسٹر رہنما چاری علاقہ تلنگانہ سے تعلق رکھنے والے ایک فرائض شناس،
 دوست نواز اور باصلاحیت جواں سال عہدہ دار ہیں۔ محکمہ تہذیبی امور کا جب رُزہ
 لینے کے بعد وہ بہتر سے بہتر پروگرامس کی پیش کشی کے لئے کوشاں ہیں۔ رہنما چاری
 صاحب سے میرے دوستانہ مراسم ہیں۔ میں ان کے مزاج کی شائستگی، طبیعت
 کی نقاست اور ان کے مخلصانہ رویہ سے بے حد متاثر ہوں۔



ڈاکٹر سی۔ نارائن ریڈی صدرین آفیشل لیگنویج کمیشن

گیمان پیٹھہ الوار ڈیا فستہ پدم شری ڈاکٹر سی۔ نارائن ریڈی (جھنگلو کے

عظیم شاعر ہیں) ۳ سال تک آفیشیل لینگویج کمیشن آف انڈیا کے صدر نشین رہے۔ ان سے پہلے مسٹر وندے ماترم پیرمن تھے۔ اُس زمانے میں تلنگانہ کے ملازمین خاص طور پر مسلمان ملازمین تلگو نہ جاننے کی وجہ سے پریشان تھے۔ جب ڈاکٹر سی نارائن ریڈی نے اپنی خدمت کا جائزہ لیا تو انہوں نے آفیشیل لینگویج کی پالیسی کو متوازن بنا دیا۔ (وہ شدت نہیں رہی جو مسٹر وندے ماترم کے زمانے میں تھی)۔ ڈاکٹر سی نارائن ریڈی کا اجلاس اور میرا سکشن ایک ہی بلڈنگ میں واقع تھا۔ اکثر ان سے ملاقات ہوتی تھی۔ جب کبھی ملازمین کے لئے تلگو میں مراسلت کا مسئلہ درپیش ہوتا۔ میں ان سے ملتا اور اس مسئلہ پر گفتگو رہتی۔ میں کہتا کہ تلنگانہ کے ملازمین اب دفاتر میں بہت کم رہ گئے ہیں جو تلگو لکھنے پڑھنے سے قطعی ناواقف ہوئے کی وجہ سے پریشان ہیں۔ آپ تلگو مراسلت کے بارے میں نرم پالیسی اختیار کریں جیسا کہ آپ کی طبیعت کا خاصہ ہے۔ اس سلسلے میں میری مسلسل ملاقات اور گفتگو سے ڈاکٹر صاحب کے ذہن میں کچھ مفید اور نئے گوشے ابھر کر آتے رہے (ویسے بھی وہ خود ایک معاملہ جہم انسان ہیں) انہوں نے کہا کہ جب بھی میں کلکٹرس کی میٹنگ بلاتا ہوں یا اضلاع کے دورہ پر جاتا ہوں تو متعلقہ محکموں کے سربراہوں سے یہی کہتا ہوں کہ جنھیں تلگو آتی ہے وہ تلگو میں مراسلت کریں۔ اور جنھیں تلگو نہیں آتی انہیں مجبور نہ کیا جائے بلکہ انہیں تلگو لکھنے پڑھنے کی ترغیب دی جائے۔ اور ایسے ملازمین جن کی عمر ۴۵ سال سے متجاوز ہوگئی ہے اور وہ جو وظیفہ کے قریب ہیں انہیں مستثنیٰ رکھا جائے۔ ڈاکٹر ریڈی کی صدر نشینی کا دور نہایت پرسکون رہا۔ پھر وہ اوپن یونیورسٹی کے وائس چانسلر ہو گئے۔

(ہیں دنوں تلگو یونیورسٹی کے وائس چانسلر ہیں)۔ ڈاکٹر سی۔ نارائن ریڈی سے میرے
 تہذیبیہ روابط ہیں اُردو شاعری میں مجھ سے شہرہ سخن کیا کرتے ہیں۔ اُن سے
 میری پہلی ملاقات اُس وقت ہوئی جب کہ وہ صدر جمہوریہ ہند مسٹر نیلم سنجواری کی
 کئی تہیتی جلسے میں جو بیلک گارڈن میں (اُن کے صدر جمہوریہ ہند بننے کے بعد
 شہر بان حیدر آباد و سکندر آباد کی جانب سے) منعقد ہوا تھا، نظم سنانے کے
 لئے آئے تھے۔ حُسنِ اتفاق سے اُردو شاعروں میں مجھے یہ اعزاز حاصل ہوا
 تھا۔ (میرے نام کی تجویز نواب میرا حمد علی خاں وزیر داخلہ حکومت آندھرا پردیش)
 نے رکھی تھی) پھر ڈاکٹر سی۔ نارائن ریڈی سے سرکاری اور عوامی مشاعروں
 میں ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ اُن سے میرے تقریباً (۳۷) سالہ دوستانہ روابط ہیں۔
 جب کبھی اُردو شعرو ادب سے متعلق کوئی بات دریافت طلب ہو تو مجھ سے ربط
 پیدا کرتے ہیں اور کبھی تو وہ موٹر بھیج کر اپنے گھر پر بلاتے ہیں اور کبھی تلگو
 یونیورسٹی پر یاد فرماتے ہیں۔ یہ سلسلہ استواری کے ساتھ آج بھی جاری ہے۔
 ڈاکٹر ریڈی ایک سچے فنکار اور کھلے دل و دماغ کے انسان ہیں۔ شکر جی
 کُلّی ہند مشاعرہ، زندہ داناں حیدر آباد کے کل ہند مشاعرہ اور سدبھاؤنا کے مشاعرے
 میں اس اعلان کے ساتھ انہوں نے اپنی اُردو نظم سُنائی کہ اس نظم پر ملنے
 اپنے شاعر دوست نیر صاحب سے اصلاح لی ہے۔ اس طرح وہ اپنی شرافت
 نفس کا ثبوت دیتے ہوئے ہزاروں لوگوں میں مجھ سے خلوص دل کے ساتھ
 اپنی وابستگی کا اعلان کرتے ہیں۔ تلگو یونیورسٹی میں ڈاکٹر صاحب کی شخصی
 دلچسپی کی وجہ سے عنقریب اُردو اور ہندی ایم۔ اے کی تعلیم کا انتظام کیا

جا رہا ہے۔ اس سلسلہ میں ایک بورڈ آف اسٹڈیز کی تشکیل عمل میں آئی ہے جس میں پروفیسر مفتی تبسم، ڈاکٹر ڈی۔ رامانج راؤ، ڈاکٹر عابد علی تھان کے علاوہ میں بھی شامل ہوں۔ ڈاکٹر صاحب نے رکن بنانے کے بعد خون۔ جیسے اطلاع دی اور کہا کہ ایم۔ اے اردو کورس کی تیاری دہائیوں کے لئے میں نے آپ کا نام بورڈ آف گورنرس میں خصوصیت کے ساتھ رکھا ہے۔ جب میں نے ڈاکٹر ریڈی سے یہ پوچھا کہ ڈاکٹر صاحب! میں نہ تو کسی کالج کا پچھر ہوں اور نہ ہی کسی یونیورسٹی کا ڈاکٹر یا پروفیسر تو پھر آپ نے مجھے کیوں بورڈ آف گورنرس میں شامل کیا تو ڈاکٹر صاحب نے جواب دیا کہ جب ایک شاعر پر یونیورسٹیز میں ریسرچ ہو سکتا ہے تو کیوں نہ اس کی صلاحیت سے تعلیمی امور میں بھی استفادہ حاصل کیا جائے، میں نے ایک شاعر کو شامل کر کے پڑائی روایت توڑ دی ہے۔



آر۔ نرسمہا راؤ اور وینکٹ رامیا اکونٹس آفیسر

میری سکریٹریٹ کی ملازمت کی تقریباً تمام مدت اکونٹس سیکشن میں گزری۔ شروع سے آخر تک میں پنچایت راج ڈیپارٹمنٹ میں رہا۔ سر راج گوپال، سی جے راجا جوگا، یو جی کے نارائن رائو، سب اینیم شاستری کے علاوہ کچھ اور اکونٹس آفیسر بھی میرے سیکشن کے اپنا راج رہے لیکن آر۔ نرسمہا راؤ اور وینکٹ رامیا صاحب

کو بھٹکانا میرے لئے ممکن نہیں ہے۔ یہ دونوں کافی عرصے تک میرے سکشن کے ایجنار ج رہے۔ ان دونوں عہدہ داروں سے میری اچھی خاصی دوستی تھی۔ کونٹس آفیسر پتے سے پہلے یہ دونوں سکشن آفیسر تھے (لیکن مجھ سے سینئر تھے)۔ جب یہ دونوں مختلف اوقات میں کونٹس آفیسر کے عہدہ پر مامور ہوئے تو انہوں نے کبھی یہ محسوس ہی ہونے نہیں دیا کہ وہ میرے آفیسر ہیں۔ دوسری اہم بات یہ تھی کہ آندھرا کے بہت سے آفیسر میری شاعرانہ پوزیشن اور تلنگانہ کے بیشتر اعلیٰ عہدیداروں سے میرے مراسم کی وجہ سے بھی میری عزت کرتے تھے۔ ان دونوں آفیسر کے زمانے میں مجھے ہر ممکن سہولتیں فراہم تھیں۔ انہوں نے کبھی بھی مجھے سڑجلہ آنے یا دفتر کے اوقات کے بعد کام کرنے کے لئے نہیں کہا۔ البتہ میرے ساتھ سکشن آفیسر جی۔ پربھاکر راؤ میرے ذمہ کا کام بھی مینجمنٹ کے دوران دیکھ رہے تھے (پہلے کام کی نوعیت کے لحاظ سے کونٹس سکشن اور کونٹس سکشن کے کام مشترکہ طور پر انجام پاتا تھا)۔ علاقہ آندھرا کے تمام اضلاع میں سکشن سے متعلق تھے اور علاقہ تلنگانہ کے تمام اضلاع میں پربھاکر سے متعلق تھے۔ یہی سکشن آفیسر کے زمانے میں جن آڈیٹرز نے مجھ سے بھرپور تعاون کیا ان میں سے کچھ نام یہ ہیں، مسز زین۔ دتا تریہ، بھگوان داس، عائشہ سلطانہ، محمد یعقوب، بیاض کشمی، غلام علی، یادگیری، محمد یونس، سدرشن، پرکاش راؤ، وائی پربھاکر راجو، بی۔ سستہ نارائنا، رانگھو بندر راؤ، این۔ وی۔ ناگ راج، کے۔ سی۔ اسرج۔ مینا، لو۔ دیو راج، سائما۔ ای۔ وی۔ کیشور راؤ، پرکاش راؤ، جی۔ ایسٹون اور سری رام چندر مورتی۔ ان آڈیٹرز نے مجھے کبھی شکایت کا موقع نہیں دیا۔ میں نے تعاون کے جواب

میں اپنی ذمہ داری پر اُن سے ہر ممکنہ رعایتیں کیں۔ میں اپنے ایک اور ساتھی سکشن آفیسر کشپا کرتن (اکونٹس ۱۱۷) سے بھی ضرورتاً کبھی کبھی تعاون حاصل کرتا رہا۔ مسٹر ارجن راؤ سکشن آفیسر اکونٹس ۱۱۷ بھی میرے رفیق کار رہے ہیں۔

میرا سکشن بنیادی طور پر ٹور سکشن تھا لیکن کبھی کبھی مجھے ٹور پر جانے کے لئے مجبور نہیں کیا گیا۔ یہ آفیسر جانتے تھے کہ میں شہر کی مختلف ادبی و تہذیبی انجمنوں سے وابستہ ہوں، اس لئے شہر نہیں چھوڑ سکتا۔ آفس کا کام دوستانہ ماحول میں کیا جاتا تھا۔ میں ان کے دور میں جس وقت بھی یہاں ہوں اجازت لے کر یا فون پر اطلاع دے کر سکریٹریٹ سے نکل جاتا تھا۔ رخصتوں کے معاملے میں کبھی بھی وہ رکاوٹ نہیں بنتے تھے۔ ویسے میں نے بہت کم رخصتیں لی ہیں۔ میں اپنے سکشن میں اپنا سارا ادبی کام بنیاد سے اطمینان کے ساتھ انجام دیتا تھا۔ کسی آفیسر نے بھی یہ نہیں پوچھا کہ سرکاری آفس میں ادبی کام کا کیا جواز ہو سکتا ہے۔ میرے ایک ساتھی مسٹر پی۔ آر۔ سی پرکھو نے جو صیغہ انتظامی (اوپنٹ) کے سکشن آفیسر تھے۔ میرے سکشن میں ٹیلی فون نصب کروایا۔ جس سے مجھے بے حد سہولت رہی۔ دفتری اوقات میں ادھر ادھر گھومنے کے بجائے میں اپنی سیٹ پر بیٹھا رہتا۔ اپنے سرکاری کام کی یکسوئی کے بعد اپنے ادبی کام کو جاری رکھتا۔ میری میز پر ہمیشہ اردو کتابیں اور اردو رسائل رہتے۔ انپیکشن کے دوران کبھی کسی آفیسر نے اعتراض نہیں کیا کہ آفس میں اردو لکھنے پڑھنے کا کیا مطلب ہے۔ حکم پنجابیت راج کے بیشتر اعلیٰ عہدہ دار میری عزت کرتے تھے۔ آفس کے تمام ساتھی بہترین

دوستوں کی طرح مجھ سے ملتے رہے، یوں محسوس ہوتا کہ ہم سب ایک ہی قبیلے سے تعلق رکھتے ہیں۔

سکرٹریٹ بے چہرہ داروں سے ہٹ کر مختلف محکموں کے جن عہدیداروں نے میری سفارش کی پذیرائی کی، ان میں مرزا سر قزاق علی ڈی ایو عبدالوحید خاں ناطق، آثارِ قدیمہ، اسد اللہ سعید آئی اے ایس ناظم ہندوستان، قادر علی خاں آئی اے ایس، جنت حین آئی اے ایس کے علاوہ ڈاکٹر موہن لال نغم بھی قابلِ ذکر ہیں۔

میں نے اپنی ساری ملازمت کے دوران نہ تو رشوت لی اور نہ ہی کسی قسم کے تحفے قبول کئے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ میں آج معاشی طور پر مطمئن رہنے کے علاوہ معاشرہ کی نگاہوں سے اوجھل نہیں ہوں۔ زندگی کے کسی مرحلہ پر بھی میں نے اپنے وقار اور طریقِ حیات کو داغدار ہونے نہیں دیا۔ دورانِ ملازمت خدا کا شکر ہے کہ میں نے بے شمار لوگوں کی مدد کی ہے، سینکڑوں ضرورت مند لوگوں کے سیکڑیں اور ضروری کاغذات پر گزٹیڈ آفیسر کی حیثیت سے دستخط کئے اور بلا تامل اللہ کے نام پر بڑی بڑی ذمہ داریاں قبول کیں۔ سینکڑوں ملازمین کے وظائف کے فارم پر تصدیقی دستخط کے علاوہ خاص طور پر مکانات کے ضروری دستاویزات پر بلا تامل غریب دلت دستخط کئے۔ جو شخص بھی اپنے کام کے لئے مجھ سے ملنے سکرٹریٹ آتا اسے میسر ہی نہیں ہوتی تھی۔



سکریٹریٹ کے عہدہ داروں سے مراسم

دورانِ ملازمت جن اعلیٰ عہدہ داروں سے میرے مراسم رہے اور جنہوں نے مختلف اہل غرض اصحاب کی کاروائیوں کے سلسلے میں مجھ سے تعاون کیا ان میں سے کچھ نام یہ ہیں۔

سرزائیس۔ اے۔ قادر آئی اے ایس، ایڈیشنل چیف سکریٹری، رائے کنج بہاری لال آئی۔ اے۔ ایس، ایڈیشنل چیف سکریٹری، بھارت چند کھنہ آئی اے ایس، سید ہاشم علی اختر آئی اے ایس، غلام دستگیر قریشی آئی اے ایس، ہاشم علی خاں آئی اے ایس، خالد انصاری آئی اے ایس، گرو داس آئی اے ایس، غلام جیلانی آئی اے ایس، فریمنڈ، لوتھر آئی اے ایس، این کے سیٹھ آئی اے ایس، محمد تاج الدین آئی اے ایس، بی این واگھرے آئی اے ایس، محسن بن شیر آئی اے ایس، اسد اللہ سعید آئی اے ایس، رمن راؤ آئی۔ اے ایس، ایم اے حلیم آئی اے ایس، اے کے گوگل آئی اے ایس، ڈاکٹر حسن الدین احمد آئی اے ایس، شیخ مولیٰ آئی اے ایس، سید تراب الحسن آئی اے ایس، سعد حسین سعد آئی اے ایس، ہماراج کرن آئی اے ایس، راجن خواجہ آئی اے ایس، غلام احمد، رشید قریشی، مبشر احمد، خواجہ حمید احمد، عبدالمجود، یس اے عزیز، کوشنا مورتی، محمد سعید خواجہ معین الدین، کے۔ بیجیا، مسٹر پچھائی آئی اے ایس، اور یحیٰ راؤ آئی اے ایس وغیرہ۔

سکرٹریٹ کے میر ساتھی

سید افضل حسین، خواجہ بہار الدین، محمد علیم الدین، محمد غوری،
 سید محمد قادری، عبدالرحیم، علی عابدی، بنجیت سنگھ ملک، پربھ اکراؤ،
 کشپا کرن، ارجن راؤ، لی۔ این۔ وانگرے، علی نواز خاں، ترسمہاریڈی، آدی نارائن
 کے سی پریچھو، نظام الدین، سید جعفر، عباس ہاشمی، بشیر انور، راج گوپال، ڈاکٹر
 منیر الزماں نیر، شکیل احمد، سلیم خاں، تحسین حسین، محمود علی، ایم۔ راج لنگم،
 حبیب محمودی، حبیب الدین، شیخ لطف، ہنمتم راؤ، منوہر راؤ، غازی الدین احمد
 حمید صدیقی، حبیب احمد، مبشر احمد، برمن، روی، فائق احمد، برکت اللہ خان
 احمد محی الدین، البشوری پرشاد سنگھی، محمد قاسم، شیخ میراں، پی سی مینیا،
 بدیع الدین، عبدالوہاب، رگھوراج، راجہ راؤ، محمد قدوس، نظام الدین،
 محمد قمر الدین، چاندپاشاہ، او۔ یاگیری، نیپارمہدی علی خاں طالب وغیرہ

سکرٹریٹ کے تین اور اہم نام

سکرٹریٹ کے ساتھیوں میں اگرچہ بہت سے نام میرے مخصوص
 اور غیر مخصوص احباب کی فہرست میں کہیں نہ کہیں اپنا عکس چھوڑ گئے ہیں۔
 مختلف وجوہات کی بناء پر سکرٹریٹ کے ساتھیوں میں تین نام میرے لئے

ناقابل فراموش ہیں۔ پہلا نام سید افضل حسین سکشن آفیسر ہوم ڈپارٹمنٹ کا ہے، دوسرا نام الحاج خواجہ بہار الدین سکشن آفیسر (موظف) کا اور تیسرا نام الحاج محمد علیم الدین اسسٹنٹ سکریٹری (موظف کا ہے) یہ تینوں نام اپنی اپنی خصوصیات کی وجہ سے پہلے نمبر پر ہی ہیں۔



○ سید افضل حسین میری ابتدائی ملازمت کے زمانے سے اختتام ملازمت تک دھوپ چھاؤں کی طرح ہمیشہ میرے ساتھ رہے ہیں۔ ایک معتبر اور کھرے انسان کی طرح اپنی زندگی کے ہر نماز پر فاتحانہ انداز سے گزرنے والے افضل حسین کی طبیعت میں آج بھی وہی بائکس، وہی خودداری، وہی انا اور وہی بھرپور خلوص ہے، جو پہلے تھا۔ دل کی باتیں ہوں کہ دماغ کی باتیں، میری سکون سی ایسی بات ہوگی جو افضل حسین سے پوشیدہ رہی ہو۔ جن دوستوں پر میں تاحیات فخر محسوس کرتا رہوں گا ان میں افضل حسین کا نام سرفہرست رہے گا۔



○ الحاج خواجہ بہار الدین ایک بہترین دوست کی طرح ابتدائی ملاقات سے آج تک سایہ کی طرح میرے ساتھ ہیں۔ میری ابتدائی شاعری کے زمانے میں خواجہ بہار الدین، افضل حسین، محمد علیم الدین، بی۔ این۔ وانگریج، خواجہ معین الدین (جو اسٹنٹ سکریٹری) اور علی نواز خاں نے نہ صرف میری شاعرانہ صلاحیتوں کو سراہا بلکہ میرے بہترین مستقبل کے لئے نیک تمناؤں کا اظہار کرتے رہے۔

خواجہ بہاء الدین نے اس طویل عرصہ میں ریڈیو، ٹی وی اور اسٹیج پروگراموں میں میری غزلیں، نظمیں جتنی تعداد میں پیش کی ہیں، کسی اور شاعر کی پیش نہیں کیں۔ سچ تو یہ ہے کہ میری موجودہ شاعرانہ پوزیشن کے تعین میں اور میری شاعری کے ابتدائی زمانے کے معاونین میں خواجہ بہاء الدین بھی ہیں۔ بعض دفعہ میرے لئے یہ امتیاز کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ بہاء الدین میرے دوست ہیں کہ بھائی۔ سیدھے سادے اور محبت شناس لوگوں میں ان کا شمار ہوتا ہے۔



○ الحاج محمد علیم الدین سکریٹریٹ کی تاریخ میں ایک نیک سیرت، خوش گفتار، پاکباز اور صاف ستھری شخصیت کی حیثیت سے یاد کئے جائیں گے جن کی دوستی کی وجہ سے ہم جیسے قلندر صفات دوستوں کا بھی بھلا ہوتا رہتا ہے۔ علیم صاحب نے سکریٹریٹ میں بے شمار لوگوں کی بلا تخصیص مذہب و ذات مدد کی ہے۔ نہایت نیک، پابند صوم و صلوة انسان ہیں۔ ان کے بارے میں یہاں تک کہا جاتا ہے کہ گذشتہ ۲۰ برسوں میں شاید ہی ان کی کوئی ناز قضا ہوئی ہو۔ ہم تمام دوست علیم صاحب کی نیکیوں کی بدولت دنیوی آلائشوں سے محفوظ رہے ہیں۔ سکریٹریٹ میں کام کرنے والے پُر خلوص احباب کے تذکرہ میں علیم صاحب کا نام بھی ایک ہمدرد انسان اور بہترین دوست کی طرح ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔



متاثر ہوئے کہ جیسے ہی میں نظم سنا کر شہ نشین سے اُتر رہا تھا انہوں نے اپنے پاس بلا کر اولاً نظم کی تعریف کی اور کہا کہ اس نظم کی ایک کاپی مجھے دیدیجئے میں نے کہا کہ میں آفس آکر دسے دوں گا۔ انہوں نے تاکیداً یہ بھی کہا کہ آپ ضرور مل لیں۔ میں آپ کی اعانت کرنا چاہتا ہوں۔ جب میں اُن سے سکریٹریٹ میں ملا تو انہوں نے مجموعے کی اشاعت سے لئے درخواست دینے کے لئے کہا۔ میں نے اپنے مجموعہ کلام 'زخموں کے گلاب' کی اشاعت کے لئے درخواست دی۔ مجھے گرانٹ مل گئی اور کتاب شائع ہو گئی۔



جناب ٹی۔ انجیا چیف منسٹر اور ملک الشعراء آجیتھن

جس زمانے میں مسٹر ٹی۔ انجیا آندھرا پردیش کے چیف منسٹر تھے تو اُن دنوں اُن کی صدارت میں زیر اہتمام کل ہند مجلس اتحاد المسلمین دیوڑھی خورشید جاہ (شاہ گنج) میں کل ہند مشاعرہ منعقد ہوا تھا۔ اس مشاعرہ میں میں نے بھی کلام سنایا تھا۔ غزل کے اس مطلع

اس بھری بزم میں پھر ماتم تنہائی ہے
کس نے مقتل سے پھر اک لاش اٹھا لائی ہے

کے بعد جب میں نے یہ شعر

جب تک ہم نہ لے لیں ہم کو یہ اندازہ نہ تھا
قاتلِ شہر کی کس کس سے شناسائی ہے

سنایا تو جناب سلطان صلاح الدین اولیسی نے چیف منسٹر صاحب سے یہ کہا تھا کہ
یہ شعر آپ کے لئے نہیں، سابقہ چیف منسٹر کے لئے ہے۔ اس مشاعرہ میں چیف
منسٹر صاحب نے ممتاز شاعر جناب آوج یعقوبی کو ملک الشعراء کا اعزاز دیئے جانے
کا اعلان کیا۔ جناب صلاح الدین اولیسی نے چیف منسٹر سے سفارشی کی تھی۔

درخواست کچھ دنوں تک چیف منسٹر کی پیشی میں رکھی ہوئی تھی۔ میں نے
متعلقہ محکمہ کو ضروری کارروائی کے لئے بھیجوائی۔ اُس زمانے میں کچھ شعراء نے
اس اعلان کے خلاف چیف منسٹر صاحب سے نمائندگی کی تھی اور بعض اصحاب نے

تحریراً اس اعلان کو منسوخ کرنے کی درخواست کی تھی لیکن یہ تجاویز اور
درخواستیں داخلِ دفتر کر دی گئیں۔ اُن دنوں آوج یعقوبی صاحب نا اُمیدی
اور غیر یقینی حالات کا شکار ہو گئے تھے۔ اُن کے خیال میں عوامی دور حکومت

میں کبھی فیصلہ کبھی بھی صادر ہو سکتا ہے اور کبھی بھی بدلا جاسکتا ہے۔ مجھ سے
آوج صاحب کی سکرٹریٹ میں ملتے رہے۔ محکمہ تعلیمات کے سکشن آفیسر جن کا تعلق
علاقہ آندھرا سے تھا، اُن سے میرا مسلسل ربط تھا۔ کارروائی کی پیش رفت کے لئے

اولیسی صاحب کی سفارشی درخواست کا ترجمہ ضروری تھا، جس کی ذمہ داری میں نے
لی، چونکہ سکشن آفیسر اردو زبان سے قطعی نا بلد تھے۔ اُردو سے انگریزی میں ترجمہ
کرنے کے بعد میں نے ترجمہ کی صحت پر بحیثیت گزٹڈ آفیسر دستخط کئے۔

میری دستخط کے بعد کارروائی حرکت میں آگئی۔ آفس کے اوقات کے بعد جی۔ او پر

سکشن آفیسر کی دستخط حاصل کی گئی۔ جی۔ او جاری ہوا۔ اخبارات میں آج یعقوبی صاحب کے ملک الشعراء ہونے کی خبر شائع کروائی گئی۔ اس طرح یہ بڑا مرحلہ جس کے لئے رکاوٹیں پیدا کی جا رہی تھیں یہ حسن و خوبی طے ہو گیا۔ آج یعقوبی صاحب کا ملک الشعراء بننے کے کچھ ہی عرصہ بعد انتقال ہو گیا۔



کالج آف اورینٹل لینگویجس کی گرانٹ

کالج آف اورینٹل لینگویجس کے پرنسپل ہاشم حسن سعید میرے بہترین دوستوں میں سے ایک ہیں۔ ان کے کالج کی گرانٹ بند ہو چکی تھی۔ (تقریباً ۴ سال سے گرانٹ نہیں مل رہی تھی) متعلقہ فائل محکمہ تعلیمات میں شریک ریکارڈ کی جا چکی تھی۔ یہ فائل ہاشم حسن سعید کی مسلسل پیروی اور میرے مکمل تعاون سے حرکت میں آ گئی۔ محکمہ تعلیمات کے ڈپٹی سیکریٹری مسٹر کرشنا مورتی اور محکمہ فنانس کے سکشن آفیسر سرتھین حسن کی شخصی دلچسپی اور بے لوث تعاون کی وجہ سے کاروائی میں جان پڑ گئی اور گرانٹ جاری ہوئی۔ ہاشم حسن سعید جب بھی اس کاروائی سے سلسلے میں سکریٹریٹ آتے تو پہلے میرے پاس آتے، پھر ہم دونوں کا سفر جاری رہتا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ہاشم حسن سعید نے اس کالج کی گرانٹ کے لئے اپنا بہت زیادہ وقت دیا۔ اگر وہ اس کاروائی کے لئے کوشاں نہ رہتے تو شاید بہت سی مشکلات پیش آتیں۔

المدينه کالج آف ایجوکیشن محبوب نگر

مسٹر این۔ بھاسکر راؤ کی چیف منسٹری کا زمانہ تھا (جن کی حکومت مشکل سے ۲ ماہ رہی)۔ اُن کے دور حکومت میں مسلم اقلیتی اداروں کے بہت سے اہم کام ہوئے۔ اُن ہی کے زمانے میں دکن میڈیکل کالج کی اجازت ملی۔ المدينه کالج آف ایجوکیشن محبوب نگر (مسلم اقلیتی انسٹی ٹیوشن) کے قیام کی منظوری ملی۔ اس کالج کے قیام کی اجازت میں میری مسلسل کوششوں کا بھی بڑا دخل رہا۔ ہے۔ کالج کے قیام کی اجازت کے لئے جناب شیخ اعلیٰ (سکریٹری) جناب مسعود علی فاروقی ایڈووکیٹ (صدر) جناب کاری (رکن) اور جناب خواجہ قطب الدین پیروی کیا کرتے تھے۔ بہت سی محکمہ جاتی رکاوٹیں حائل تھیں۔ ایک موزم نے دیکھا کہ محکمہ تعلیمات کی عمارت کے ایک کارنر پر درخت کے نیچے یہ حضرات کھڑے ہوئے ہیں۔ محبوب نگر کے مشاعروں کے سلسلے میں ان حضرات سے میری جان پہچان تھی۔ میں نے سکریٹریٹ آنے کی وجہ پوچھی اور انہیں اپنے سکشن لے گیا۔ اس ملاقات کے بعد میں نے ان اصحاب کی خواہش پر کاروائی میں دلچسپی لی۔ یہ سلسلہ تقریباً پچھ ماہ تک چلتا رہا۔ اس پس منظر پر ملاقات کے بعد جب کبھی یہ اصحاب سکریٹریٹ آتے تو پہلے میرے پاس آتے، پھر فائل کا پوزیشن جاننے کے لئے محکمہ تعلیمات اور فینانس کے پیر کاٹتے۔ اس سلسلے میں مسٹر کرشن موہرتی ڈپٹی سکریٹری محکمہ تعلیمات نے (جو

میرے حکم کے ساتھی دوست اور علاقہ تنگنا (حیدرآباد) سے تعلق رکھتے تھے، غیر معمولی دلچسپی لی۔ ان ہی کی کوشش اور تعاون کی وجہ سے کالج کے قیام کی اجازت کی ساری رکاوٹیں دور ہوتی گئیں۔ اس سلسلے میں فنانس ڈپارٹمنٹ کے سکشن انفیرتھین حسین نے بھی مکمل تعاون کیا۔ مسٹر این بھاسکر راؤ چیف منسٹر کی حکومت کے خاتمہ سے ۲۰۳ دن پہلے بہت سے اصحاب نے اپنی اپنی کاروائیوں کی نیکسوئی کر لی۔ المدینہ کالج آف ایجوکیشن کی فائیل چیف منسٹر کی دستخط کے بعد حکم تعلیمات میں پہونچی۔ این بھاسکر راؤ کی چیف منسٹری شاید صرف ایک دن یا دو دن باقی رہ گئی تھی۔ ایسے غیر یقینی حالات میں، میں نے تعلیمات کے متعلق ڈپٹی سکریٹری، اسسٹنٹ سکریٹری سکشن آفیسر اور دیگر اسٹاف کے تعاون سے قریب ۸ بجے شب جی۔ اوپر دستخط حاصل کئے۔ جی۔ او جاری ہوا۔ اخبارات میں خیر چھپوائی۔ آل انڈیا ریڈیو کی علاقائی غیروں میں کالج کے قیام کی منظوری کا اعلان کروایا گیا۔ اگر اس جی او کی اجرائی میں تاخیر ہوتی تو اس کالج کے قیام میں شاید کچھ اور وقت لگ جاتا۔



ہندی اکیڈمی

جب راجگداری اندرا گھنہ راج گیر جی مدرشین ہندی اکیڈمی اور ہندی کے ممتاز شاعر جناب اوم پرکاش تریمل ز سکریٹری تھے اُن دونوں سے سکریٹریٹ

میں ملاقات ہوئی جو ہندی اکیڈمی کی گرانٹ کی منظوری کے سلسلے میں سکریٹریٹ
 آئے تھے۔ ویسے ہندی اکیڈمی کی تشکیل جدید کے سلسلے میں ان دونوں سے فرق
 پر گفتگو ہوا کرتی تھی اور میں انہیں کاروائی کی نوعیت اور اس کی پیش رفت کے
 بارے میں اطلاع دیتا رہتا تھا۔ جس زمانے میں منظوری کا مسئلہ اُلجھا ہوا تھا۔
 اُس زمانے میں نرمل جی کا سکریٹریٹ آنا گویا معمول سا ہو گیا تھا۔ وہ اکثر و بیشتر
 سکریٹریٹ آتے۔ سکریٹریٹ میں ان کے حافظہ اور ان کی نشست کا کوئی مسئلہ
 نہیں تھا۔ میں اپنے سکشن میں رہوں یا نہ رہوں اُن کے لئے ایک نمائندہ کسی موجود
 رہتی۔ اُن کا آنا جانا کچھ اس قدر بڑھ گیا تھا کہ سکریٹریٹ کے بعض ملازمین خاص
 فہم پر رہ پشش سکشن کے ذمہ داران انہیں سکریٹریٹ کا ہی ایک عمدہ دار سمجھنے
 لگے۔ نرمل جی بلا جھجک سکریٹریٹ آتے، جیسے ہی وہ سکریٹریٹ میں داخل ہوتے سیدھے
 میرے پاس آجاتے۔ ہم دونوں کافی باور چلے جاتے۔ چائے، سکریٹ نوشی کے
 بعد کبھی تو مسٹر کرشنا مورتی ڈپٹی سکریٹری محکمہ تعلیمات کے پاس جاتے اور کبھی
 تحسین صاحب سکشن آف سر فیئانس ڈپارٹمنٹ کے پاس جاتے۔ ان دونوں کے
 پاس اردو، ہندی اکیڈمیوں کے اعلقہ اور کئی علمی و ادبی اداروں کی گرانٹ کی
 کاروائیاں بھی زیر دوران رہتی تھیں اور دونوں نہایت دلچسپی سے کاروائی کی
 یکسوئی تک مکمل تھاون کرتے تھے۔ حسن اتفاق سے یہ دونوں میرے بہتوں
 دوست تھے۔ مسٹر کرشنا مورتی اور جناب تحسین حسین کی شخصی دلچسپی کی وجہ سے
 ہندی اکیڈمی کی نوے فیصد کاروائی تکمیل کو پہنچ گئی تھی، اور ہماری مسلسل کوششوں سے
 گرانٹ منظور ہوئی۔ میرے اس تعاون سے ہندی کے ادبی حلقوں میں میری بڑی پذیرائی ہوئی۔

ادارہ ادبیات اُردو

جب میں نے علی گڑھ سے میٹرک کا امتحان کامیاب کیا تو مجھے اس بات کی خواہش تھی کہ علوم مشرقیہ کے تمام امتحانات کامیاب کروں۔ چنانچہ میں نے ایک دن ادارہ ادبیات اُردو کا رُخ کیا اور وہاں ادارہ کے منتظم جمال الدین صاحب سے ملا اور اُن سے میں نے ادارہ کے امتحانات کے بارے میں معلومات حاصل کیں۔ میں نے ادارہ ادبیات اُردو کے اُردو عالم اور اُردو فاضل کے امتحانات اچھے نمبراً کے ساتھ کامیاب کئے، اُردو فاضل کی اساس پر میں نے جامعہ اُردو علی گڑھ کا امتحان ادیب کامل بہ درجہ اول کامیاب کیا۔ جامعہ نظامیہ حیدرآباد سے منشی فاضل کا امتحان کامیاب کیا۔ اس طرح میں نے علوم مشرقیہ کی اہم ڈگریاں حاصل کیں۔

یہی بڑی خواہش تھی کہ میں کسی کالج میں شریک ہو جاؤں اور پھر عثمانیہ یونیورسٹی میں زیر تعلیم رہوں (جو نکل میں گورنمنٹ سروس میں تھا اس لئے عثمانیہ یونیورسٹی میں شرکت ممکن نہ ہو سکی)۔ جب مجھے یہ معلوم ہوا کہ ایسے طالب علم جو ادیب کامل کامیاب ہوں، جامعہ عثمانیہ کے امتحان لی۔ اور ایل میں شریک ہو سکتے ہیں تو میں نے اُردو لیوننگ کالج، حایت نگر، میں ۱۹۴۱ء میں داخلہ لیا۔

لی۔ اور ایل کامیاب کرنے کے بعد میں نے ایم۔ اور ایل (سائنس ایم۔ اے، اُردو) کامیاب کیا۔

ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور ہمیشہ میری حوصلہ افزائی کیا کرتے تھے۔ یوم محمد قلی قطب شاہ کی ایک سالانہ تقریب کے موقع پر ڈاکٹر صاحب نے مجھے ادارہ ادبیات اُردو بلایا اور مجھ سے خواہش کی کہ میں مخدوم محی الدین صاحب کی مشہور نظم ”بھاگ متی“ ترنم سے سناؤں۔ ڈاکٹر صاحب نے مجھ سے ترنم میں نظم سنی، انہیں ترنم پسند آیا، اور پھر ان کی خواہش پر میں نے دو نظم یوم محمد قلی قطب شاہ کے اختتامیہ اجلاس (جو احاطہ گنبد محمد قلی قطب شاہ منعقد ہوا تھا) میں سنائی۔ ایک دفعہ ڈاکٹر زور نے حوصلہ افزائی کرتے ہوئے کہا تھا کہ بی۔ او۔ ال۔ لیجے منبرات کے ساتھ پاس کرلو، میں تمہیں اعلیٰ تعلیم کے لئے یاہر بھیج دوں گا۔

ڈاکٹر صاحب کی یہ خصوصیت تھی کہ ہر اُس نوجوان کو جس کے بارے میں ان کا خیال تھا کہ وہ ترقی کر سکتا ہے اُس کی حوصلہ افزائی کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے حیدرآباد کے بے شمار نوجوانوں کو ادارہ کے مختلف شعبوں سے وابستہ کیا، اور اُن سے اُردو کی ترویج و اشاعت کا کام لیتے رہے۔ لکھنے اور بولنے کی مشق کی اہمیت ذہن نشین کروائی۔ چنانچہ ایسے بہت سے نوجوان شاعر و ادیب، جن کی زور صاحب نے سرپرستی کی کج اُردو ادب میں ایک اچھا خاصا مقام رکھتے ہیں۔

میں نے ڈاکٹر صاحب کی زندگی میں، خاص طور پر ایوان اُردو میں کئی مشاعرے پڑھے ہیں۔ ایوان اُردو میں سجاد ظہیر صاحب کی زیر صدارت منعقدہ مشاعرہ میں، میں نے بھی اپنا کلام سنایا تھا۔ اُسی مشاعرہ میں پہلی دفعہ میں نے ڈاکٹر زور کو بڑا غزل سناتے ہوئے دیکھا تھا۔ یوم محمد قلی قطب شاہ تقاریب کے سلسلے میں جب دیت بازی کے بین کلیاتی مقابلے منعقد کئے گئے تھے تو ڈاکٹر زور نے مجھے مقابلہ

بیت بازی کا کنوینر بنایا تھا۔ ڈاکٹر زور کے انتقال کے بعد بھی میرا ربط ادارہ ادبیاتِ اردو سے برقرار رہا۔ میں نے ادارہ کے کئی مشاعروں کی معہدی بھی کی ہے۔ سب رل گولڈن جو بلی تقاریب کی تیاریوں کے سلسلے میں کچھ جیسے اعزازی طور پر اپنا راج تقاریب کی حیثیت سے کام کرتا رہا۔ اس طرح ادارہ ادبیاتِ اردو کی سرگرمیوں سے کبھی نہ کسی طرح میری وابستگی رہی۔



اردو اور سنٹل کالج

اردو اور سنٹل کالج، انجمن ترقی اردو آف انڈیا پر دیش کے انتظامیہ کے تحت قائم ہوا۔ اس کالج کے فارغ التحصیل طلباء نے بھی زندگی کے مختلف شعبوں میں اپنی شناخت بنائی ہے۔ اردو اور سنٹل کالج میں داخلہ کے بعد میری شعری و ادبی زندگی کا رخ ہی بدل گیا۔ میں جب بی۔ او۔ ایل کا طالب علم تھا تو اردو اور سنٹل کالج کی ادبی انجمن بزم ادب اردو کا ۲۸ اگست ۱۹۵۹ء کو بلا مقابلہ صدر منتخب ہو گیا۔ پھر میں جامعہ عثمانیہ کے زیر اہتمام تمام ملحقہ کالجوں کے تعاون سے منعقدہ آخری اردو فیسول کے مشاعرہ کا بلا مقابلہ معتمد منتخب کیا گیا۔ میں نے بی۔ او۔ ایل کے طالب علمی کے زمانے میں اپنے کالج (اردو ہال) میں بین کلیاتی مقابلوں اور مختلف شعری و ادبی سرگرمیوں کو فروغ دینے میں دلچسپی لینی شروع

کی۔ میرے ذہن میں یہ بات پیوست ہو گئی تھی کہ شہر کے دوسرے کالجوں کے مقابلے میں شعروادب کی سرگرمیوں کے لئے اُردو کالج کو زیادہ سے زیادہ نمایاں رہنا چاہیئے۔ چنانچہ میں نے مختلف قسم کی ادبی سرگرمیاں جاری رکھیں۔ اُردو کے ساتھ میں پروفیسر ابو ظفر عبدالواحد، پروفیسر سید محمد، ڈاکٹر حسینی شاہد، ڈاکٹر نیت ساہو، پروفیسر مفتی تبسم اور منظور احمد منظور قابل ذکر تھے۔ (یہ تمام اساتذہ میرے شفیق استادوں میں شامل رہے)۔ خاص طور پر پروفیسر ابو ظفر عبدالواحد کامیری شاعرانہ صلاحیتوں کو نکھارنے میں زیادہ دخل رہا۔ وہ مجھے اپنے شاگردوں میں سب سے زیادہ چاہتے تھے۔ میں اکثر اوقات اُن کے دولت خانہ (اعظم پورہ) پر حاضری دیتا اور شعروادب سے متعلق مختلف مسائل پر گفتگو کرتے ان سے استفادہ حاصل کیا کرتا تھا۔ ڈاکٹر حسینی شاہد اور مفتی تبسم نے بھی میری حوصلہ افزائی میں کمی نہیں کی۔ میں نے بی۔ او۔ ال کامیاب کرنے کے بعد اُردو کالج میں ایم۔ او۔ ایل کے لئے داخلہ لیا لیکن میں نے ایک کلاس بھی اٹل نہیں کی۔ ڈاکٹر حسینی شاہد مجھ سے کہا کرتے کہ میں شاعر ہے پڑھنا کم کردوں اور امتحان کی تیاری میں لگا رہوں اور یہ کہتے کہ ایم او ایل کامیاب کرنا بہت مشکل ہے، یوں ہی سرسری پڑھو کہ کامیاب نہیں ہو سکتے۔ البتہ اُس شام کالج آیا تھا جس شام یونیورسٹی کے کچھ ذمہ داران معائنہ کرنے کے لئے آئے واپس تھے۔ جب میں کالج پہنچا تو ڈاکٹر حبیب ضیاء درک دے رہی تھیں، اُن کی کلاس کے بعد کالج درخواست ہو گیا۔ ایم۔ او۔ ایل کا امتحان میں نے اپنے طور پر پڑھ کر دیا تھا اور الحمد للہ ہائر سکنڈ کلاس میں کامیاب رہا۔ ادیب کافی اور اُردو فاضل کے کورس میں بیشتر کتابیں ایسی تھیں جن کے مطالعہ سے ایم او ایل

کی کہ میں آسانی سے پڑھی جاسکتی تھیں، اس نے مجھے اپنے طور پر پڑھنے میں دقت نہیں ہوئی، البتہ کئی زبان کے سلسلے میں پروفیسر سید محمد صاحب سے میں نے استفادہ حاصل کیا ہے۔

اُردو کالج کی طالب علمی کے زمانے میں اُردو مجلس کی سرگرمیاں شہابہ پر تھیں۔ منظور احمد اور معنی تبسم اُردو مجلس کے معتمدین تھے۔ خاص طور پر منظور احمد صاحب نے اُردو مجلس کی غیر معمولی خدمات انجام دی ہیں۔ منظور احمد نے مجلس کا مولوی عبدالحق شائع کیا تھا۔ میں اُن دنوں منظور احمد صاحب سے مجلس کی اشاعت اور اُردو مجلس کے سالانہ جلسوں کے سلسلہ میں خاص طور پر تعاون کیا کرتا تھا۔ میری دلچسپی سے متاثر ہو کر صدر اُردو مجلس رائے بانگی پرشاد نے مجھ سے اُردو ہال کی ایک تقریب کے دوران کہا تھا کہ میاں آپ منظور صاحب کا ہاتھ بٹائیے بڑا احسان ہوگا۔ رائے بانگی پرشاد کا انداز ہی ایسا تھا کہ وہ ہر شخص سے نہایت انکساری کے ساتھ گفتگو کیا کرتے تھے۔ اُردو مجلس کی جزوی وابستگی سے بھی شہر کے ادبی حلقوں اور ادبی شخصیتوں سے میرے روابط بڑھنے لگے۔ شاعر کی حیثیت سے بھی میری شہرت ہونے لگی۔



اُردو فیسول

میں جب بی۔ او۔ ایل کا طالب علم تھا تو آخری اُردو فیسول منعقد ہوا۔

۱۹۵۹ء کا فیٹول، چھٹا فیٹول تھا۔ اُس وقت میں بزمِ اُردو، اُردو کالج کا صدر تھا۔ چونکہ اُردو فیٹول بین کلیاتی اُردو فیٹول ہوتا تھا، جس میں مشاعرہ کے علاوہ کلچرل پروگرام، محفلِ موسیقی اور دیگر ادبی سرگرمیاں جاری رہتی تھیں۔ کالج میں میری شاعری کی کچھ زیادہ ہی شہرت تھی، جس کی وجہ سے، میں اُردو فیٹول مشاعرہ کا معتمد مشاعرہ منتخب ہوا۔ مسعود مستین صدر اُردو فیٹول تھے اور الطاف حسین معتمد، ہم تینوں ہم خیال تھے اور ہم میں اچھی خاصی دوستی تھی۔ (اس وقت مسعود مستین ڈپٹی کمرشیل منیجر آفیسر ہے)۔ الطاف حسین ایک تاجر آنیوس کا لڑکا تھا (جو دو سال قبل ہم سے ہمیشہ کے لئے جدا ہو گیا) نہایت مخلص اور نفیس انسان تھا، خدا اس کو غریقِ رحمت کرے)۔ میری شاعری کے ابتدائی دور کے احباب میری زندگی کا اہم سرمایہ ہیں، جن کی یادیں آج بھی میری ہم سفر ہیں۔ اُردو فیٹول کا نشہ ہینوں باقی رہا بلکہ اتنے برسوں کے بعد جب بھی اُن سرگرمیوں کا خیال آتا ہے تو زندگی کئی برس پیچھے جاتے ہوئے خوشبو کا سفر طے کرنے لگتی ہے۔ مشاعرہ کی صدارت، شاہد صدیقی صاحب نے کی تھی۔ جس میں حیدر آباد کے نامور شاعروں کے علاوہ مختلف کالجس کے نمائندہ شعراء نے کلام سنایا تھا۔ پروفیسر عبدالقادر سروری، صدر شعبہ اُردو جامعہ عثمانیہ، مشیرِ اعلیٰ تھے۔ منظور احمد پکھراج اُردو کالج، مشاعرہ کمیٹی کے مشیر تھے اور پروفیسر مفتی تبسم پکھراج سیف آباد کالج شبِ نغمہ کے مشیر تھے۔ مفتی تبسم اور منظور احمد کی طرح جناب حمید الدین شطاری نے بھی کلچرل پروگرام کے مشیر کی حیثیت سے بڑی نمایاں کام انجام دیا۔ اُردو فیٹول کی وجہ سے مختلف کالجس کے طلباء میں آپسی ہم آہنگی پیدا

ہو جاتی تھی۔ ایک ادبی و تہذیبی ماحول بن جاتا تھا۔ ہر سال اُردو فیسٹول نہایت شاندار پیمانے پر منائے جاتے رہے۔ چھ فیسٹول آخری تھا، اس کے بعد کچھ ایسے حالات ہوئے کہ اُردو طلباء کی سالانہ سرگرمیاں یک لخت ختم ہو گئیں اب یہ حال ہے کہ کالجس اور یونیورسٹیوں میں بین الیاتی فیسٹول کا تصور ہی نہیں کیا جاسکتا۔ فیسٹول کے زمانے میں ہر کالج میں ایک عجیب قسم کی خوشگوار فضا سارے ماحول پر چھا جاتی تھی۔ ہر کالج میں انتخابات ہوتے، ہر کالج کی بزم اُردو کے صدر کو فیسٹول کی مختلف کمیٹیوں میں شامل کیا جاتا۔ فیسٹول کی اہم ترین اور دلچسپ تقاریب صرف تین ہوتی تھیں، ایک مشاعرہ، دوسرا شبِ نغمہ اور تیسرا کلچرل پروگرام۔ بالخصوص کلچرل پروگرام اور شبِ نغمہ کے سلسلے میں طلباء کو کافی محنت کرنی پڑتی تھی۔ فیسٹول کے زمانے میں ایک ادبی میگزین بھی شائع ہوتا تھا۔



یوم محمد علی قطب شاہ اور مقابلہ بیت بازی

میں جب اُردو اور نیشنل کالج میں زیر تعلیم تھا تو اُس وقت بیت بازی کے مقابلوں میں کچھ زیادہ ہی حصہ لیا کرتا تھا، بلکہ بعض دفعہ مجھے خود بھی بیت بازی کے مقابلوں کا اہتمام کرنا پڑتا تھا (چونکہ میں اُن دنوں بزم اُردو ادب اُردو

کالج کا صدر تھا، بیت بازی کا یہ نظام میرے لئے ایک یادگار مقابلہ ثابت ہوا۔ جس کو میں آج تک بھلا نہیں پایا۔ یہ بات سننے کی ہے۔ ڈاکٹر زور بقید حیات تھے۔ ادارہ ادبیات اردو کی سالانہ تعاریب (یوم محمد قسلی قطب شاہ) کی سرگرمیوں کے سلسلے میں انٹر کالجس بیت بازی کے مقابلے بھی ہوتے تھے۔ ڈاکٹر زور نے مجھے ان مقابلوں کا کنوینر مقرر کیا تھا بیت بازی کے مقابلے علی کاٹیج، نواب ظہر علی خاں کی رہائش گاہ (معلم جاہی مارکٹ) میں ہوتے تھے۔ وینس کالج (کلید انات، کوٹلی) کی ٹیم فائنل میں آگئی تھی۔ فاطمہ نسرین اُس وقت وینس کالج کی بزم اردو کی صدر تھیں۔ جب میں پہلی مرتبہ صادق نقوی (معلم نظام کالج) کے ہمراہ وینس کالج پہنچا تو سب سے پہلے میں نے ڈاکٹر ثمیمہ شوکت سے ملاقات کی۔ وہ اُس وقت وینس کالج میں اردو کی لکچرار ہی نہیں، بزم اردو وینس کالج کی مشیر بھی تھیں۔ میں اُس وقت صدر بزم اردو ادب، اردو کالج اور کنوینر بین کلياتی بیت بازی مقابلہ کی حیثیت سے وینس کالج گیا تھا تاکہ بزم اردو وینس کالج کی طالبات کو بھی مقابلوں میں شرکت کی دعوت دے سکوں۔ کچھ دیر بعد ثمیمہ شوکت نے فاطمہ نسرین کو بلوایا۔ مجھ سے تعارف کروایا۔ ثمیمہ شوکت نے یہ کہہ کر وینس کالج کی طالبات کو مقابلہ بیت بازی میں شرکت کی اجازت دی کہ میں ذمہ داری کے ساتھ ٹیم کی تمام طالبات کو اپنے ساتھ کوٹلی لے (گنبد محمد قسلی قطب شاہ) لے جاؤں اور واپس لے آؤں۔ بیت بازی کا فائنل مقابلہ یوم محمد قسلی قطب شاہ کے افتتاحیہ اجلاس سے قبل یعنی ۲ بجے صبح گنبد محمد قسلی قطب شاہ میں ہوا۔ انگریز تہذیب میں ممتاز شاعر جگن ناتھ آزاد آئے ہوئے تھے۔ انہوں نے علامہ اقبال

کا ایک شعر پڑھ کر مقابلہ بیت بازی کا آغاز کروایا۔ مجلس میں منظور احمد اور مفتی تبسم شامل تھے۔ حسن اتفاق سے ویمینس کالج کی ٹیم نے فائنل مقابلہ جیت لیا اور ان لڑکیوں کو انعامات کے علاوہ خصوصی انعامات بھی دیئے گئے۔ جب اختتام تقریب ختم ہوئی تو ان لڑکیوں کو ذمہ داری کے ساتھ افضل گنج تک بس میں لے آیا، پھر وہاں سے انیس رکشاؤں میں ان کے گھر بھجوا دیا۔ میرے اس ذمہ دوار سلوک سے مختلف کالجوں کی تعاریب کے سلسلے میں ایک خوشگوار فضا ابھر آئی۔ مجھے ہر کالج سے مکمل تعاون حاصل ہوتا رہا۔ چنانچہ میں نے اردو کالج کے زیر اہتمام ان دو سالوں کے درمیان کئی تعاریب کا اہتمام کیا۔ پھر ہم سبھوں نے مل کر اردو فیسٹول منایا۔ وہ دو سال میری زندگی کے انمول اور سنہرے سال تھے، جنہیں میں تاحیات نہیں بھلا سکتا۔ (کالج کی سرگرمیوں کے زمانے میں ہاشم حسن سعید نے بھی مختلف مرحلوں پر میرا ساتھ دیا تھا۔)



اردو مجلس

مرزا فرحت اللہ بیگ نے اپنے چند دوستوں کے تعاون اور مشوروں سے "اردو مجلس" کے نام سے ایک ادبی انجمن کی بنیاد رکھی۔ میں اردو مجلس کا تقریباً ۷۱ سال تک متحدہ عمومی رہ چکا ہوں۔ جب منظور احمد صاحب

نے اُردو مجلس سے استعفیٰ دے دیا تو اُن کے بعد نواب حسین علی خاں ۶ ماہ تک معتمد رہے۔ جب وہ مستقل سنوت کے لئے لندن چلے گئے تو ان کے بعد میر حسن نے معتمد اُردو مجلس کی حیثیت سے زائد ایک سال کام کیا، پھر ان کے بعدیں اور قاطمہ عالم علی خاں ۶ ماہ تک اُردو مجلس کے معتمد رہے۔ جب قاطمہ عالم علی خاں اپنی نجی مصروفیات کی وجہ سے اُردو مجلس سے بے تعلق ہو گئیں تو تنہا میں معتمد رہا۔ رائے جانکی پرشاد صدر تھے۔ اُن کے انتقال کے بعد مولوی حبیب الرحمن صدر اُردو مجلس رہے۔ حبیب الرحمن صاحبہ پاکستان چلے گئے تو ڈاکٹر حسینی شاہد نے اُن کی ذمہ داری سنبھالی۔ ابتداء میں اُردو مجلس کے جلسوں میں شرکاء کی ایک اچھی خاصی تعداد رہتی تھی، لیکن رفتہ رفتہ تعداد گھٹنے لگی۔ یہاں تک کہ میری معتمدی کے آخری دنوں میں ۱۵، ۱۰ اصحاب شرکت کرنے لگے تھے۔ اب ادبی جلسوں کے لئے اُردو ہال اتنا اہم مرکز نہیں رہا۔ قدیم شہر مغل پورہ میں اُردو گھر کی تعمیر کے بعد یوں لگتا ہے کہ اُردو ہال کی ساری ادبی سرگرمیاں اُردو گھر میں منتقل ہو گئی ہیں۔ میں نے اپنی معتمدی کے ۷ برسوں میں بلا وقفہ بے شمار ادبی جلسوں کا اہتمام کیا ہے۔ اُردو ہال میں بڑے بڑے دانشوروں کا خیر مقدم کیا گیا۔ ابتداء میں اُردو مجلس کے جلسے اراکین اُردو مجلس کے گھروں میں ہوا کرتے تھے، پھر جب اُردو ہال کی عمارت تعمیر ہوئی تو اُردو ہال میں جلسے ہونے لگے۔



روزنامہ سیاست

جب میں اردو کالج میں بی۔ او۔ ایل کا طالب علم تھا تو اُس زمانے میں کالج کی بونی سرگرمیاں کافی حد تک بڑھ چکی تھیں۔ میں کالج کی بزم اردو کا صدر تھا۔ میں چاہتا تھا کہ اردو کالج کی سرگرمیاں شہر کے دوسرے کالجس کے مقابلے میں نمایاں رہیں۔ کالج کے جلسوں کی خبریں روزنامہ سیاست، رہنمائے دکن، نظام گزٹ اور ٹائپ آفس، جاکر دیا کرتا تھا۔ ایک دن جناب محبوب حسین جگر جو انٹیل ایڈیٹر سیاست نے جناب شاہد صدیقی کو (جو وہاں موجود تھے) مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ یہ صلاح الدین تیرہ ہیں۔ اردو کالج کی بزم اردو کے صدر۔ بزم اردو کی نیوز لے کر آئیں۔ شاہد! انہیں محفل شعر کا کالم دے دو۔ (ان دنوں شاہد صدیقی صاحب سیاست میں شیشہ و تیشہ کا کالم لکھنے کے علاوہ محفل شعر بھی ترتیب دیا کرتے تھے، یہ ۱۹۵۹ء کی بات ہے)۔ شاہد صدیقی نے مجھے محفل شعر کی ذمہ داری سونپی۔ چنانچہ میرا معمول تھا کہ ہر چار شنبہ کی شام سیاست چلا جاتا اور محفل شعر کا کالم ترتیب دیتا۔ یہ سلسلہ چل ہی رہا تھا کہ اخبار سیاست میں مختلف موضوعات پر شعری و ادبی نئے کالموں کا اضافہ ہو گیا۔ محترم عابد علی خاں اور جناب محبوب حسین جگر کی خواہش پر مجھ نے سیاست کے لئے مختلف مختلف شعری مقابلے، 'بامحاورہ اشعار'، شعر میں تشبیہات، 'بہترین اشعار کا انتخاب'، الف سے شروع ہونے والے اور ی، پر ختم ہونے والے اشعار کا انتخاب اور تقریباً ۱۲۵ شاعروں کا تعارف معہ

نمونہ کلام، لکھا اور یہ سلسلہ محمد قلی قطب شاہ سے دور حافر کے شاعروں

ملک جاری رہا۔ بہترین اشعار پر انعامات کا سلسلہ تقریباً زائد از ۵۰ سال تک جاری رہا۔ ایک ماہ کے بعد تجسس کی میٹنگ ہوتی تھی (میں کنوینر رہتا) اور انعام یافتگان (اول و دوم میں آتے والوں) کو ادانہ سیاست کی جانب سے رقمی مدد دی جاتی۔ انعامات کے اعلان کے ساتھ تجسس کی تصویریں گروپ کی شکل میں شائع ہوتی تھیں۔ میں ۱۹۶۰ء سے ”سیاست“ سے وابستہ ہوں۔ اب تو میرا زیادہ وقت سیاست ہی میں گزرتا ہے۔ محترم جگر صاحب مجھ سے کبھی سب میڈیٹری کا کام لیتے ہیں تو کبھی پریس کانفرنس اور کبھی جلسوں کی رپورٹنگ کے لئے بھیج دیتے ہیں۔ بنیادی طور پر میں شجرہ شعرو سخن سے تعلق رکھتا ہوں، لیکن جگر صاحب مجھ سے ادبی اور صحافتی دونوں کام لیتے ہیں۔ اور یہ تمام کام انتہائی خوشگوار ماحول اور با اعتماد قضاہ میں انجام پاتے ہیں۔ بقول جناب عابد علی خاں ”میری صبح سیاست سے شروع ہوتی ہے اور شام ہمیں پہنچتا ہے ختم ہوتی ہے“ — سیاست سے وابستگی نہ صرف میرے لئے اعزاز ہے بلکہ اُن سب کے لئے ہے جو کسی نہ کسی حیثیت سے سیاست سے تعلق رکھتے ہیں۔ جناب عابد علی خاں مجھ پر غیر معمولی طور پر مہربان ہیں، اسی طرح جگر صاحب کی عنایتوں کا ایک سلسلہ غلط فہمی میرے شامل حال ہے۔ عابد علی خاں صاحب کی سفارش کی وجہ سے ہی میرے بڑے لڑکے شمس الدین عارف کو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں ایم ایس سی میں داخلہ ملا۔ (جبکہ وہاں جناب علی محمد خسرو وائس چانسلر تھے) نظام کالج سے بی۔ ایس سی فرسٹ کلاس ہونے کے باوجود عثمانیہ یونیورسٹی میں ایم۔ ایس سی میں داخلہ نہیں ملا، جس کی وجہ سے عارف کو علی گڑھ جانا پڑا۔ جناب

غابد علی خاں اور جناب محبوب حسین جگر، میرے دوستوں اور کرم فرماؤں کے سلسلہ میں بھی بھرپور تعاون کیا کرتے ہیں۔ جناب عابد علی خاں اور جناب محبوب حسین جگر نے مجھے ہمیشہ اپنا چھوٹا بھائی سمجھا، جو ہمیشہ میرے وقار کا بھی پوری طرح خیال رکھتے ہیں۔ ادارہ سیاست اور ان دونوں شخصیتوں نے میری ذہنی تربیت میں اہم رول ادا کیا ہے۔ سیاست کی وجہ سے میرا سوشل پوزیشن بھی اچھا خاصا بن گیا ہے۔ مجھ پر یہ دونوں شخصیتیں بھرپور اعتماد کرتی ہیں۔ میں نہایت دیانت داری اور ایمانداری کے ساتھ اس اعتماد کو نبھا رہا ہوں۔ انشاء اللہ ان کے اعتماد کو کبھی ٹھیس نہیں پہنچے گی۔



نظام گزٹ

جس نمائندے میں عبدالرحمن علی، نظام گزٹ کے انچارج تھے، اُس وقت میں اپنے ایک شاعر دوست عظمت ندیمی کے ساتھ اُن سے ملتا تھا۔ میرے ادبی و شعری ذوق کو دیکھ کر علمی صاحب نے مجھ سے خواہش کی تھی کہ میں نظام گزٹ میں شعرو سخن کے کالم کا اضافہ کروں۔ چنانچہ میں ہر ہفتہ اُردو کے ایک ممتاز شاعر کا انتخاب کلام شائع کیا کرتا تھا۔ یہ کالم اس قدر مقبول ہوا کہ ایک دان حضور نظام (نواب میر عثمان علی خاں آصف سیل) نے علمی صاحب سے دریافت کیا کہ

صلاح الدین نیسر کون ہے۔ (غالبؒ یہ ۱۹۵۹ء کی بات ہے)۔ اُس زمانے میں مجھے اُردو کے اہم شاعروں کا کلام پڑھنے کا شوق تھا اور میں اپنے ذوق کی تکمیل کے لئے ہر شاعر کے تمام شعری مجموعوں کے مطالعہ کے بعد اپنے ہمناموں کا انتخاب کیا کرتا تھا۔



خاتونِ دکن

ماہنامہ خاتونِ دکن کا پہلا شمارہ نومبر ۱۹۶۲ء میں شائع ہوا۔ چوتھے شمارہ (مارچ ۱۹۶۲ء) سے میں بہ حیثیت مدیر اعزازی رسالہ سے وابستہ ہوا۔ ہر شمارہ ۴۸ صفحات پر مشتمل ہوتا تھا۔ صالحہ الطاف مالک و مدیرہ کے علاوہ مجلسِ ادارت میں ان کی چار بہنیں اختر سلطانہ، صبیحہ سعید، صابرہ سعید اور عذرا سعید شامل تھیں۔ خاتونِ دکن کی اشاعت کے سلسلے میں صالحہ کے شوہر جناب الطاف حسین کے ادبی ذوق و تھاون کا بڑا دخل رہا ہے۔

خاتونِ دکن کے پہلے شمارہ کی رسمِ اجراء تقریب دیندر اہل دلی تھیٹر میں اُس وقت کے گورنر آندھرا پردیش کے ہاتھوں انجام پائی، جس میں شہر کے تقریباً تمام اہم شاعروں، ادیبوں، دانشوروں اور زندگی کے مختلف شعبوں سے تعلق رکھنے والے اصحاب نے شرکت کی تھی۔ میں بھی اس تقریب میں شریک تھا۔ رسمِ اجراء

کے فوری بعد شاندار پیمانے پر کلچرل پروگرام ترتیب دیا گیا تھا۔ جلسہ کے اختتام پر صالحہ الطاف سے ملاقات ہوئی۔ میں نے رسالہ کی اشاعت پر انہیں مبارکباد دی۔ صالحہ الطاف سے میری پہلی ملاقات بانو طاہرہ سعید کی رہائش گاہ واقع شتی نگر پر ایک پُر تکلف عمارت اور محفلِ شعر کے موقع پر ہوئی تھی۔ صالحہ الطاف نے "خاتونِ دکن" کے سلسلے میں مجھ سے تعاون کی خواہش کی۔ میں حسبِ وعدہ اُن کے گھر واقع مگر باولی (مستڑی میر عالم) گیا۔ بانو طاہرہ سعید نے صالحہ کو مشورہ دیا تھا کہ رسالہ کی اشاعت کے سلسلے میں میری خدمات ٹیکہ شگون ہوں گی۔ اس لئے انہوں نے مشاورت اور تعاون کے لئے مجھے باہم راہ اپنے گھر بلوایا تھا۔ چونکہ صالحہ الطاف صحافتی میدان میں نئی نئی دافنی ہوئی تھیں، ان سے ملاقات کے بعد ایسا محسوس ہوا کہ بانو طاہرہ سعید نے میری کچھ زیادہ ہی تعریف کی ہے۔ صالحہ الطاف نے مجھ پر اعتماد کرتے ہوئے پروجیکٹ کی تمام تر ذمہ داری سونپ دی۔ صالحہ الطاف سے میں نے یہ بھی کہا تھا کہ میں اعزازی طور پر کام کروں گا، چونکہ مجھے خود بھی اُردو شعرو ادب سے بے حد دلچسپی ہے، رسالہ سے وابستگی کی وجہ سے میرے شعری و ادبی ذوق کی مرید تسکین ہو سکتی تھی۔ میں نے صالحہ الطاف سے یہ بھی کہا تھا کہ شاعروں اور ادیبوں سے میں خود ہی خط و کتابت کروں گا۔ اس لئے کہ میں حیدر آباد اور ملک کے بیشتر شاعروں اور ادیبوں سے واقف ہوں، اُن سے تخلیقات کے حصول میں آسانی ہوگی۔ صالحہ نے اس بات سے مکمل اتفاق کیا۔

ق
 "خاتونِ دکن" کے نام سے ادبی حلقوں کا یہ خیال تھا کہ یہ رسالہ خاتونِ دکن

کی طرح صرف خاتون ادیبوں اور شاعرات کے لئے مختص رہے گا، لیکن ہم نے اس رسالہ کو خالص ادبی رسالہ بنادیا، جس میں مرد و خواتین اہل قلم کی تخلیقات شامل رہتی تھیں۔ خاتونِ دکن کی ابتداء ۳، ۴ اشاعتوں میں کافی اخراجات ہو گئے تھے، میں نے جیسے ہی پرچہ کی ذمہ داری سنبھالی، پرچہ خود کتنی ہو گیا۔ خانگی اشتہارات کی ذمہ داری الطاف بھائی نے قبول کی تھی۔ میری سجاوٹیں کی وجہ سے حکومت ہند، ریاستی حکومت اور دیگر کمپنیوں وغیرہ کے اشتہارات خاتونِ دکن کو حاصل ہونے لگے۔ جب الطاف بھائی اور صالحہ آپا دو حرقہ قطر چلے گئے تو رسالہ بند ہو گیا۔

خاتونِ دکن کے تبادلے میں ہر ماہ تقریباً ۲۵ رسالے ہندوستان و پاکستان سے آتے تھے جو میرے ذوق کی تسکین کے لئے ایک اہم سرمایہ تھے۔ میں نے خاتونِ دکن کے ذریعہ کئی نئے لکھنے والوں کو ادبی حلقوں میں متعارف کرایا ہے۔

میں اس بات کا خاص خیال رکھتا تھا کہ حیدرآباد کے شاعروں اور ادیبوں کی تخلیقات زیادہ سے زیادہ شائع ہوں، لیکن معیار کا بہرحال ملحوظ رکھتا تھا۔ تمام تخلیقات کا انتخاب ہم دونوں مل کر کرتے تھے۔ ادارہ کبھی صالحہ الطاف لکھنوی اور کبھی میں لکھتا۔ ترتیب و تزئین میں بھی ہم دونوں کی مشاورت شامل رہتی۔ وقت کام و دہن کا صفحہ اختر سلاطین کے ذمے تھا، مجید سعید عکس و عکس کے زیرِ عنوان کسی ایک نامور شاعر کا انتخاب کام شائع کرواتی تھیں۔ صابرہ سعید اُردو کے بہترین شعروں کا انتخاب پیش کرتیں اور عکرا سعید کے ذمہ ڈیزائن،

مرقعے اور سرور قی تھا۔

خاتونِ دکن کے بعض خصوصی نمبر بھی شائع ہوئے ہیں جن میں قابلِ ذکر غزلِ نمبر اور ڈرامہ نمبر ہیں۔ صالحہ الطاف کا گھرانہ علم و ادب سے دلچسپی رکھتا ہے۔ اُن کے والدِ محترم جناب احمد سعید کامیاب تاجر ہونے کے علاوہ علم و ادب سے بے حد لگاؤ رکھتے تھے۔ ممتاز صحافی جناب حبیب اللہ اوج میر 'میزان' (حیدرآباد) (پہلا پاکستان کے شہری ہیں)، صالحہ آپا کے حقیقی چچا ہیں۔ صالحہ الطاف ایک منفرد ادیب و ڈرامہ نگار کی حیثیت سے عالمی پہچانی جاتی ہیں۔



بزمِ سعدی

۲۵ جون ۱۹۵۹ء کو بزمِ سعدی کا قیام عمل میں آیا جس کے بانیوں میں حضرت قدر علی، ڈاکٹر طاہر علی خاں مسلم اور قمر ساحری کے علاوہ راقم الحروف شامل ہے۔ یہ بزم فارسی داں شعراء کی بزم تھی جس کے صدر حضرت قدر علی تھے۔ نائب صدر ڈاکٹر طاہر علی خاں مسلم، معتمد قمر ساحری اور شریکِ معتمد صلاح الدین نائبتر اسی بزم کے تحت ماہانہ فارسی طرحی مشاعری ہوتے تھے۔ میں اپنا فارسی کلام محفوظ نہ رکھ سکا۔ میرے مجموعہ کلام 'یہ کیسا رشتہ ہے' میں ایک فارسی منقبت شامل ہے۔



ادارہ اتحاد الشعراء

بزمِ قدرِ ادب کی جانب سے حضرت قدرِ عظمیٰ کی قیام گاہ واقع باغِ قریبہ میں
 (حسینی علم) میں ۱۱ جون ۱۹۶۰ء کو ایک جلسہ منعقد ہوا جس میں یہ طے پایا کہ ادارہ
 اتحاد الشعراء کا قیام عمل میں لایا جائے۔ چنانچہ انجمن 'شہنشاہ' زاویرِ ادب،
 ادبستانِ مقلی، بزمِ کامل، بزمِ جہان، سفینہٴ ادب اور قدرِ ادب کے تعاون سے
 ایک نئی انجمن تشکیل دی گئی۔ یہ اتفاقِ آراء علامہ غلامِ آفندی صدر اور صلاح الدین نیر
 معتمدِ عمومی منتخب ہوئے۔ اراکین میں حضرت قدرِ عظمیٰ، تاجِ قریشی، عبدالحمید عیالہ،
 ریورنڈ ریاضی شامل تھے۔ اس اجلاس میں یہ طے کیا گیا کہ مشاعرہ میں وقت کی پابندی
 کی جانی چاہیے اور اگر کوئی شاعر مشاعرہ شروع ہونے کے نصف گھنٹہ بعد آئے تو اس
 کو کلامِ شناسانہ کی اجازت نہیں ہوگی۔ اس قسم کی انجمن کا قیام حیدرآباد کی
 تاریخ میں پہلا ادبی تجربہ تھا۔ اس ادارہ سے حیدرآباد کی تقریباً ۲۵ شعری و
 ادبی انجمنوں کا الحاق ہوا تھا، جس کا میں ادارہ کے ختم ہونے تک معتمدِ عمومی رہا۔
 ادارہ کے سرپرستوں میں ڈاکٹر زور کے علاوہ مولانا سید نجم احمد، علامہ قدرِ عظمیٰ
 رہے۔ اس ادارہ کا حیدرآباد کے ممتاز شاعر و کالم نویس جناب شاہد صدیقی،
 روزنامہ سیاست کے شیشہ و تیشہ کے کالم میں خاکہ اڑایا کرتے تھے۔ شاہد صاحب
 کا یہ خیال تھا کہ شعراء کو وقت پر مشاعروں میں شرکت کے لئے پابند کرنا ممکن
 نہیں۔ شاعر آزاد مزاج ہوتا ہے، جب اس کا جی چاہے، جس وقت چاہے مشاعرہ

میں شریک ہو سکتا ہے۔ جب ادارہ اتحاد الشعراء کے تعلق سے سیاست کے شیشہ و تیشہ کے کالم میں مسلسل لکھا جانے لگا تو میں نے جگر صاحب (محبوب حسین) جوائنٹ ایڈیٹر سیاست سے شکایت کی کہ شاہد صدیقی صاحب اتحاد الشعراء کا مذاق اڑا رہے ہیں تو جگر صاحب نے مجھے نہایت عمدگی سے سمجھایا کہ شیشہ و تیشہ ایک ایسا کالم ہے جس میں جو کچھ لکھا جاتا ہے اُس میں مزاح شامل رہتا ہے (چونکہ یہ طنز و مزاح کا کالم ہے)۔ اس کالم کے ذریعہ کسی انجمن یا کسی شخص کا مذاق اڑانا پیش نظر نہیں رہتا، آپ کو چنناں خفا ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔

ادارۃ اتحاد الشعراء تقریباً ۶۵ سال تک کام کرتا رہا، اس کے بعد یہ ادارہ ختم ہو گیا۔ چونکہ میں 'قدر ادب' کا معتمد عمومی تھا، اس لئے اتحاد الشعراء کے معتمد کی حیثیت سے کام کرنے میں مجھے سہولت رہی۔ میں اس بزم کے مشاعروں کے سلسلے میں اپنے استاد (علامہ قدر علی) سے مشورہ لیا کرتا تھا۔ اتحاد الشعراء کے مشاعرے حضرت قدر علی کی قیام گاہ باغ فرید و جاہ (حسینی علم) پر ہی ہوتے تھے۔ جس میں حیدر آباد کے تمام مکتب خیال کے شعراء شرکت کرتے تھے۔ مشاعروں میں آدابِ محفل کا خاص طور پر خیال رکھا جاتا تھا۔



بزمِ جیون

مشہور تاجر بہار چہ جناب آر آر جیون لال نے پیرانے شہر (علی پٹنہ) کا شیر

میں بزم جیون کا قیام عمل میں لایا تھا۔ اس بزم کے مشاعرے پابندی سے ہوا کرتے تھے جس میں محمد امجد علی الدین صاحب جیلے سرکردہ شاعروں نے بھی شرکت کی تھی۔ میری خواہش پر محمد امجد صاحب نے ایک مشاعرہ کی صدارت بھی کی تھی۔ میں اس بزم کا تقریباً دو سال تک مقعد عمومی رہا، فیض الحسن خیال، فرید مقعد تھے۔ جیون لال صاحب کو شعر و شاعری کا بے حد شوق تھا، چونکہ ان کا کام زیادہ تر شوق اور ساقط البحر ہوتا تھا، اس وجہ سے بھی بعض اصحاب صرف ان کے کلام سے لطف اندوز ہونے کے لئے آتے تھے۔ اس بزم کے مشاعروں میں حیدر آباد کے تمام نمائندہ شعراء شریک رہتے تھے۔ مجھ سے پہلے بناب روحی قادری مقعد تھے۔ جیون لال صاحب کے سانحہ ارتحال کے بعد یہ بزم ختم ہو گئی۔ میں نے اپنی مقعدی کے زمانے میں اس بزم کی سرگرمیوں کو کافی وسعت دی تھی۔ اس بزم کے اکثر مشاعرے طرحی ہوا کرتے تھے، جن میں ہر مکتب خیال کے شاعر کلام سُنتے تھے۔



ادبی ٹرسٹ

قیام ادبی ٹرسٹ (۱۹۶۶ء) سے میں ایک بے لوث خدمت گزار کی حیثیت سے بلا معاوضہ ادبی ٹرسٹ کی سرگرمیوں سے وابستہ ہوں۔ ایک دن جناب علامہ شمیم گل ٹرسٹی ادبی ٹرسٹ نے مجھ سے کہا تھا کہ میں چاہتا ہوں کہ ادبی ٹرسٹ کی سرگرمیوں میں تم بھی دلچسپی لو، ٹرسٹ کو ایک بے لوث کارکرد اور ایک حیانتدار

ساتھی کی غرورت ہے۔ میں نے جواباً کہا تھا، انشاء اللہ آپ کا مجھ پر یہ اعتماد ہمیشہ برقرار رہے گا۔ چنانچہ تادم تحریر اُسی اعتماد کی فضا میں کام کر رہا ہوں۔ کل ہند مشاعروں کی خط و کتابت کا کام بھی زیر نگرانی جناب عابد علی خاں میرے ذمے ہی رہتا ہے۔ سولے اکاؤنٹس کے سارے انتظامی معاملات سے میں کسی نہ کسی حیثیت سے وابستہ رہا کرتا ہوں۔ عابد علی خاں صاحب کی سرپرستی میں بلا شکایت نہایت ذمہ داری سے باوقار انداز کے ساتھ پُر اعتماد فضاء میں ٹرسٹ کا کام انجام دے رہا ہوں۔ ادبی ٹرسٹ کی سرگرمیاں، خدمات کی اعلیٰ سطح تک پہنچ گئی ہیں۔ کل ہند مشاعروں کا شہرہ جناب عابد علی خاں کی شخصی دلچسپی کا آئینہ دار ہے۔ اب تک ۲۷ مشاعرے ہو چکے ہیں۔ ادبی ٹرسٹ کے مشاعروں میں ملک کے تمام اہم شاعروں نے شرکت کی ہے، پاکستان اور دیگر بیرونی ممالک کے شاعر بھی شرکت کرتے رہتے ہیں۔ صفائیل کے شاعروں کی شرکت کا سلسلہ آج بھی جاری ہے۔ جناب عابد علی خاں نے مشاعروں کو آمدنی سے ادبی ٹرسٹ، اردو گھر ٹرسٹ، اردو تعلیمی ٹرسٹ، ادارہ ادبیات، اردو ٹرسٹ، ویرن آف عثمانیہ ٹرسٹ قائم کیا ہے، انوار العلوم کالج اور رکن میڈیکل کالج کی رقی اعانت کی۔ ادبی ٹرسٹ کے زیر اہتمام کئی شاعروں اور ادیبوں کی کتابوں کی اشاعت کے لئے رقی امداد دی گئی ہے، طبی اعانت کے لئے بھی امداد دی جاتی ہے، اور یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے۔ میڈیکل کالج اور انجینئرنگ کالج کے طلباء کو بھی تعلیمی امداد دی جاتی ہے۔ ادبی ٹرسٹ ایک ایسا مستحکم ادارہ ہے جس کا فیضان مختلف صورتوں میں شعر و ادب کے پرستاروں تک پہنچتا رہتا ہے۔ ایسے مختصر ادارہ میں کام کرتے ہوئے مجھے بے حد خوشی محسوس ہوتی ہے۔

ادارہ شعر و حکمت

ادارہ شعر و حکمت سے زائد از ۲۵ برس سے بحیثیت معتمد عمومی وابستہ ہوں۔ ڈاکٹر مفتی تبسم اس ادارہ کے بانی و صدر ہیں۔ اس ادارہ کے تحت بعض خاص خاص مواقع پر ادبی محفلیں ہوا کرتی ہیں۔ اکثر شاعروں اور ادیبوں کی کتابوں پر ناشر کی حیثیت سے اس ادارہ کا نام استعمال کیا جاتا ہے۔ چونکہ یہ ادارہ ادبی حلقوں میں اہمیت کا حامل سمجھا جاتا ہے اس لئے بہت سے قلم کار کسی نہ کسی عنوان کے تحت ادارہ سے اپنی وابستگی کا اظہار کرتے ہیں۔ اس ادارہ کی جانب سے کئی شاعروں اور ادیبوں کی کتبوں کی رسم اجراء تقاریب بھی منائی جا چکی ہیں۔ بیرونی دانشوروں، شاعروں اور ادیبوں کی ادارہ کی جانب سے خیر مقدم کیا جاتا ہے۔

ادارہ شعر و حکمت کی جانب سے ایک ششماہی ادبی رسالہ 'شعر و حکمت' کے نام سے شائع ہوتا ہے، جس کا پہلا شمارہ ۱۹۷۷ء میں شائع ہوا۔ ادارہ کے اغراض و مقاصد میں ادبی جلسے، سمینار منعقد کرنا، رسالہ کی اشاعت، اور اشاعت کتب شامل ہیں۔ 'شعر و حکمت' نے اردو میں جمہوریت کو فروغ دینے میں اہم حصہ ادا کیا ہے۔ اس رسالہ کو ہندوستان و پاکستان کے قریب تمام اہل قلم والوں کا تعاون حاصل ہے۔



زندہ دلان حیدر آباد

زندہ دلان حیدر آباد سے میرا دیرینہ تعلق ہے۔ زندہ دلان حیدر آباد کے زیر اہتمام جب پہلی کئی ہند کانفرنس (۱۴ مارچ، ۱۹۶۶ء میں) منعقد ہوئی تھی (جس میں کوشن چندر، فکر تونسوی، پروفیسر فرقت کا کوردی، تخلص بھوپالی، یوسف ناسم، خواجہ عبدالغفور، احمد جمال پاشا، سلی صدیقی، دلاور فقار، رفیع نقوی و اہمی وغیرہ نے شرکت کی تھی) میں نے چیرمین رابطہ کمیٹی کی حیثیت سے اپنی ذمہ داریاں نبھالی تھیں۔ میں زندہ دلان حیدر آباد کی سرگرمیوں میں اس کانفرنس کے بعد سے وابستہ ہو گیا۔ گزشتہ دو سال سے پروگرام کمیٹی کا کنوینر ہوں۔ زندہ دلان حیدر آباد کی شہرت نہ صرف سارے ملک میں بلکہ عالمی ہو چکا ہے۔ سارے ملک میں مزاج نگاروں کی یہ پہلی انجمن ہے جس نے طنز و مزاح کو فروغ دینے میں اہم حصہ ادا کیا ہے، جس کی سالانہ تقاریر میں ملک کے نامور طنز و مزاح نگار شرکت کیا کرتے ہیں۔ زندہ دلان حیدر آباد کے اہم خدمت گذاروں میں مجتبیٰ حسین، حیات اللہ، ڈاکٹر سید مصطفیٰ کمال، بھارت چند کھنہ، نریندر لو تھر، مصطفیٰ علی بیگ، مسیح انجم، دیاب قیصر، سعادت حسین، محمد سلیمان، طالب خوند میری، رشید قریشی، ڈاکٹر حبیب فیاض، یوگیش حیدر آبادی وغیرہ کے نام خصوصیت کے ساتھ لئے جاسکتے ہیں۔ آج بھی زندہ دلان حیدر آباد کے سالانہ اجلاس اور مشاعرے شاندار پیمانے پر منعقد ہوتے ہیں۔ اس اجلاس کا ترجمان ماہنامہ 'شگوفہ' ہے جو ممتاز ادیب و نقاد ڈاکٹر سید مصطفیٰ کمال

کی ادارت میں گذشتہ ۲۳ سال سے پابندی کے ساتھ شائع ہو رہا ہے جس کے خصوصی نمبر ایک دستاویزی حیثیت کے حامل ہوا کرتے ہیں۔ اس رسالہ کی وجہ سے بہت سے نئے لکھنے والوں نے ادبی حلقوں میں اپنی شناخت بنالی ہے۔ یہ پرچہ آج بھی اہتمام کے ساتھ شائع ہو رہا ہے۔ زندہ دلائل حیدرآباد کے سالانہ اجلاس کے موقع پر سو وینر بھی شائع کیا جاتا ہے۔

شکوہ کی مجلس ادارت میں راقم الحروف بھی شامل کیا گیا ہے۔ شکوہ کا آفس مجرد گاہ (معظم جاہی مارکٹ) کی اوپری منزل پر واقع ہے۔ اس دفتر پر اکثر شام کے وقت کچھ شاعر و ادیب جمع رہتے ہیں۔ ڈاکٹر سید مصطفیٰ کمال نام و نمد سے بے نیاز رہ کر خاموشی سے کام کرنے کے عادی ہیں، جن کے اطراف ان کے احباب کا بڑا حلقہ موجود رہا کرتا ہے، صدر شعبہ اُردو انوار العلوم کالج کی حیثیت سے اپنی خدمات انجام دے رہے ہیں۔



سکریٹریٹ اُردو اسوسی ایشن

فضل علی کمیشن کی رپورٹ کی روشنی میں ریاستوں کی تقسیم کے بعد میرا متعلقہ محکمہ ڈائریکٹریٹ آف کیمونٹی پروجکٹ، سکریٹریٹ کے پلاننگ اینڈ ڈیولپمنٹ ڈیپارٹمنٹ میں ضم ہو گیا (چونکہ میرے محکمہ کا ایک سیکشن سکریٹریٹ کے

پلاننگ ڈیپارٹمنٹ سے وابستہ تھا۔ جنوری ۱۹۵۷ء سے میں سکریٹریٹ میں کام کرنے لگا ہوں۔

سکریٹریٹ اُردو ایسوسی ایشن کی شعری، ادبی و تہذیبی سرگرمیوں کا ذکر کرنے سے پہلے اُن محرکات کا تذکرہ بھی ضروری سمجھتا ہوں، جن کی روشنی میں سکریٹریٹ اُردو ایسوسی ایشن کا قیام عمل میں آیا۔ اس ایسوسی ایشن سے پہلے سکریٹریٹ میں کسی بھی قسم کی اُردو انجمن کا وجود نہیں تھا۔

ریاستوں کی تقسیم (۱۹۵۶ء) کے بعد سکریٹریٹ میں آندھرا پردیش سکریٹریٹ کچلرل ایسوسی ایشن کی سرگرمیوں کا بڑا شہرہ تھا۔ اے پی کچلرل ایسوسی ایشن کے زیر اہتمام ہر سال نومبر ڈسمبر کے ادوار میں سالانہ تقاریب کے طور پر سات روزہ کچلرل پروگرامس ہوا کرتے تھے جس میں اُردو کا کوئی بھی پروگرام شامل نہیں رہتا تھا، اگر شامل بھی رہا تو بڑے نام مختصراً میوزیکل پروگرام رہتا تھا۔ چونکہ ہم اُردو والے بھی کچلرل ایسوسی ایشن کے ممبر بن چکے تھے، اس لئے ہماری کوششوں سے یہ وقت تمام سات روزہ پروگرام کے دوران کسی ایک دن (۳۰) منٹ یا ایک گھنٹہ کا اُردو پروگرام ہوتا تھا۔ اس مختصر مدت میں ہم لوگ کبھی اُردو ڈرامہ پیش کرتے اور کبھی محفل موسیقی کا اہتمام کرتے اور کبھی مشاعرہ منعقد کیا کرتے تھے۔

اُن دنوں آل انڈیا ریڈیو حیدرآباد سے اُردو کی بعض انجمنوں کو پروگرامس ملا کرتے تھے۔ اُس زمانے میں سکریٹریٹ میں کوئی اُردو انجمن نہیں تھی، اس لئے ہم آل انڈیا ریڈیو حیدرآباد کے شعبہ اُردو کے پروگرام انزیکیٹو مسٹریا ترو سے (جو میرے دوست تھے) خواہش کی کہ آندھرا پردیش سکریٹریٹ کے کچلرل ایسوسی ایشن

کے نام کنٹراکٹ فارم روانہ کریں۔ مسٹر پاترونے حسب وعدہ اردو پروگرام کی پیشکش کے لئے سکریٹریٹ پکچرل اسوسی ایشن کے نام کنٹراکٹ فارم روانہ کیا، لیکن اسوسی ایشن کے ڈائریکٹر نے یہ لکھ کر کنٹراکٹ فارم واپس کیا کہ ہماری اسوسی ایشن اردو پروگرام پیش کرنے کے موقف میں نہیں ہے۔ جب مجھے یہ بات مسٹر پاترونے سے معلوم ہوئی تو میں نے ارادہ کر لیا کہ حاصل کردہ پروگرام سے کبھی بھی صورت میں استفادہ کرنا چاہیئے۔ چونکہ پروگرام کی پیش کشی کے لئے کسی ایک اسوسی ایشن کا ہونا ضروری تھا، اس لئے میں نے سکریٹریٹ کے چند ہم خیال دوستوں سے انجمن کے قیام کے بارے میں مشورہ کیا۔ پھر میں نے فون پر جناب بھارت چندکھنہ سے (جو اُس وقت گورنر آندھرا پردیش کے سکریٹری تھے) صدر انجمن بننے کی خواہش ظاہر کی۔ اسی طرح فون پر ہی نائب صدور کے لئے جناب غلام احمد صاحب اور جناب رشید قریشی سے جو علی الترتیب ڈپٹی سکریٹری اور اسسٹنٹ سکریٹری تھے، خواہش کی میرے اصرار پر ان تینوں عہدہ داروں نے ازراہ ادب نوازی میرے جذبہ کی ستائش کی۔ پھر میرے احباب نے انجمن کی معتمدی کی ذمہ داری مجھے سونپی۔ اُس وقت کے قابل ذکر احباب میں خواجہ بہار الدین، افضل حسین، علیم الدین، بی۔ این۔ والکر، عباس ہاشمی اور بشیر احمد شامل ہیں۔ اس طرح ۲۴ جون ۱۹۶۹ء کو سکریٹریٹ اردو اسوسی ایشن کا قیام عمل میں آیا۔

سکریٹریٹ اردو اسوسی ایشن کی ادبی و تہذیبی سرگرمیوں کا آغاز

۲ جولائی ۱۹۶۹ء کو آل انڈیا ریڈیو کے اردو بچہ گوام سے ہوا۔ ۲۰ منٹ کے اس پروگرام میں افضل حسین اور سیدہ محسنہ نے افسانے سنائے۔ صلاح العقیقہ فیر احمد

بشیر انور نے غریب اور نکلیں سنائیں۔ کچھ دنوں کے بعد اسوی ایشن کو پُر قار بنانے کے لئے اُس وقت کے ایڈیشنل چیف سکریٹری جناب ایس۔ اے۔ قلاڑ کی اسوی ایشن کے لئے سرپرستی حاصل کی گئی۔ جب جناب ایس۔ اے۔ قلاڑ صدر نیشن پبلک سروس کمیشن بن کر سکریٹریٹ سے چلے گئے تو سکریٹریٹ اُردو اسوی ایشن کے سرپرست کی حیثیت سے جناب دے مے کنج بہاری لال کی خدمت سے استفادہ کیا جاتا رہا، جو اُس وقت ایڈیشنل چیف سکریٹری تھے۔ ان کے بعد چیف سکریٹری حکومت ائندھرا پردیش جناب شراون کار اسوی ایشن کے سرپرست رہے۔ انجن کے قیام کے بعد علی الترتیب جناب بھارت چند کھنہ، جناب غلام احمد جناب ایس۔ اے۔ واسح اور جناب صادق احمد انجن کے صدر رہے۔ اس وقت جناب تواب الرحمن صدر ہیں۔ نائب صدر کی حیثیت سے سکریٹریٹ کے اعلیٰ عہدیدار مسز ہاشم علی اختر، رامن رائے، ایس۔ اے۔ واسح، ایس۔ اے۔ عزیز، صادق احمد رشید قریشی، مبشر احمد، صلاح کون، اور سعد حسین سعد وغیرہ انجن کی سرگرمیوں میں حصہ لیتے رہے۔ متبرعوں کی حیثیت سے قیام انجن سے ہی میں کام کر رہا ہوں۔ شعبہ موسیقی کے ایجناراج کی حیثیت سے خواجہ بہاء الدین، محمد حسین خاں، عباس ہاشمی اور شکیل احمد وابستہ رہے۔ اس وقت ڈاکٹر میٹر انز مالن منیر اور شکیل احمد شریک منہ ہیں۔ جناب بہار الدین شعبہ موسیقی کے ایجناراج ہیں۔ سکریٹریٹ اُردو اسوی ایشن کا پہلا ادبی پروگرام سکریٹریٹ کے کیٹی ہال میں ۱۲ جولائی ۱۹۷۷ء کو ہوا، جس کی صدارت صدر اسوی ایشن جناب بھارت چند کھنہ نے کی تھی۔ جبکہ سرپرست انجن کی حیثیت سے جناب ایس۔ اے۔ قلاڑ ایڈیشنل چیف سکریٹری نے شرکت کی تھی۔

اُن محفلوں میں ریاستی وزراء، مختلف محکموں کے معتمدین اور دیگر اعلیٰ عہدہ دار شریک ہوتے ہیں۔ اس انجمن کا ایک وصف یہ بھی ہے کہ اس انجمن کی رکنیت کی کوئی فیس نہیں ہے۔ اب تک بیسیوں ریڈیائی پروگرامس پیش کئے جا چکے ہیں ریڈیائی پروگرام سے معاوضہ بھی ملتا ہے، اُن ہی ذرائع سے وقتاً فوقتاً ہونے والے جلسوں اور مشاعروں کے اخراجات کی تکمیل کی جاتی ہے۔ اس اسوسی ایشن کا ایک اہم کارنامہ ایک ادبی سوویت کی اشاعت بھی ہے جس میں سکریٹریٹ کے اہل قلم اعلیٰ عہدہ داروں اور دیگر ملازمین کی تخلیقات کے علاوہ دفاتر معتمدین کے مختلف محکمہ جات میں کام کرنے والے ادب دوست اصحاب کے گروپ فرٹوز بھی شامل ہیں۔ سوویت کی اشاعت، مالیہ کی فراہمی اور اُس کی صورت گری میں جناب ایس۔ اے۔ واسح کا زبردست تعاون حاصل رہا۔ یہ یادگار دستاویزی سوویت ۲۴ اگست ۱۹۷۱ء کو شائع ہوا، جس کا مدیر میں تھا۔ اردو اسوسی ایشن کا ایک شعبہ موسیقی بھی ہے، جس کے اراکین ہر سال صنفی نمائش کے موقع پر نمائش کلب میں میوزیکل پروگرام پیش کرتے ہیں۔ یہ سلسلہ گزشتہ ۱۲ سال سے جاری ہے۔ شعبہ موسیقی کے اہم اراکین، خواجہ بہار الدین، عباس ہاشمی اور فکیل احمد ہیں، مرحوم محمد حسین نے بھی کافی دلچسپی لی۔ اسوسی ایشن کے بعض خصوصی پروگرام رویت راجھاتی تھیٹر اور اندراپدیہ درشنی میں منعقد کئے جا چکے ہیں۔ اب تدار میں ہماری مخفیس سکریٹریٹ کے کمیٹی ہال میں منعقد ہوا کرتی تھیں لیکن ادھر کچھ برسوں سے ہماری مخفیس مولانا ابوالکلام آزاد ریسرچ انسٹی ٹیوٹ میں (بارغ عامہ) منعقد ہو رہی ہیں۔ شروع شروع میں ہماری محفلوں میں سکریٹریٹ کے بہت سے اصحاب شریک ہوا کرتے تھے لیکن

اب سکریٹریٹ میں افسوسناک حد تک اردو زبان اور اردو شعر و ادب سے دلچسپی لینے والوں کی تعداد گھٹ چکی ہے۔ پھر بھی ہم نے اپنے عزائم کا چراغ جلائے رکھا ہے۔ ہم نے اسوسی ایشن کی بقار کے لئے کچھ خوشگوار تبدیلیاں لاتے ہوئے سکریٹریٹ اردو اسوسی ایشن کی سرگرمیوں میں اُن سابقہ اعلیٰ عہدہ داران سکریٹریٹ اور ملازمین کو بھی شامل کیا ہے جو اردو زبان و ادب سے دلچسپی رکھتے ہیں۔ سکریٹریٹ اردو اسوسی ایشن کی سرگرمیاں آج بھی جاری ہیں۔



محفلِ خواتین

ڈسمبر ۱۹۷۱ء میں محفلِ خواتین کا قیام عمل میں آیا۔ حیدرآباد کی تعلیم یافتہ خواتین کی یہ ایک ادبی انجمن ہے جس کی روح رواں محترمہ عظمت عبدالقیوم تھیں۔ قیام انجمن ہی سے میں مشیر محفلِ خواتین کی حیثیت سے وابستہ ہوں۔ ان برسوں میں محفلِ خواتین نے غیر معمولی ادبی خدمات انجام دی ہیں۔ محفلِ خواتین کے ادبی اجلاس ہر ماہ پابندی سے ہوتے ہیں جن میں شہر کی تعلیم یافتہ خواتین کے علاوہ کالجس اور یونیورسٹیوں کی طالبات نہ صرف شرکت کرتی ہیں بلکہ اپنی تخلیقات بھی پیش کرتی ہیں۔ محفلِ خواتین خاص علمی و ادبی انجمن ہے جس میں ہر مکتب خیال کی اہل قلم خواتین حصہ لے سکتی ہیں۔ اس محفل کے قیام کے بعد

کئی شاعرات اور خاتون ادیب منظر عام پر آچکی ہیں۔ حیدر آبادی تقریباً ۲۵ شاعرات کو اس محفلِ خواتین کا تعاون حاصل رہا ہے۔ محفلِ خواتین کو برے ملک میں یہ اعزاز حاصل ہے کہ یہ اپنی نوعیت کی پہلی شعری و ادبی انجمن ہے جس سے صرف خواتین وابستہ ہیں۔ اس محفل کو پروان چڑھانے میں عظمت عبد القیوم خدمات ناقابلِ فراموش ہیں۔ اس محفل کے زیرِ اہتمام تاحال ۵ ادبی میگزین شائع ہو چکے ہیں جن میں صرف خاتون اہل قلم کی تخلیقات شامل ہیں۔ عظمت عبد القیوم کی زیرِ ادارت ۴ (چار) میگزین شائع ہو چکے ہیں، ۵ واں ادبی میگزین عظمت عبد القیوم کے انتقال کے بعد محمد محفل خواتین فاطمہ عالم علی خاں کی ادارت میں نکلا (شریکِ مدیر مظفر النساء نازقیس) اُن پانچ ادبی میگزین کا بنیادی کام (مسبات کی تصحیح و کلمات، پروف ریڈنگ، طباعت وغیرہ، عظمت عبد القیوم کی نگرانی) بالراست میں نے انجام دیا ہے۔ محفلِ خواتین کے سالانہ جلسوں کے علاوہ ریلوں کی رات کے نام سے تاحال ۳ شبِ موسیقی کا عایشان پیمانے پر اہتمام کیا۔ میں نے مشیر محفلِ خواتین کی حیثیت سے تمام سرگرمیوں کی مکمل نگرانی کی، ایہ تقاریب نہایت اہتمام کے ساتھ سرانجام پائیں۔ محفلِ خواتین کی سرگرمیوں اور اُس کے طریقہ کار کے تعین میں عظمت عبد القیوم کے ساتھ میرا بھی بڑا دخل رہا ہے۔ میں، محفلِ خواتین کی صورت گیری اور اس کو سوار نے میں عظمت عبد القیوم کے دستِ راستہ کی حیثیت سے کام کیا ہے۔ محفلِ خواتین آج بھی اپنی سرگرمیوں کو جاری رکھے ہوئے ہے لیکن عظمت عبد القیوم کی کمی کا ہر وقت احساس ہوتا ہے۔

محفلِ خواتین کا کوئی مسئلہ یا ادبی کام ایسا نہ تھا جو میرے مشورہ اور توجہ

بے اختیار محفل پاتا ہو۔ اس کا اطلاق عظمت عبدالقیوم کی زندگی تک رہا۔ عظمت عبدالقیوم نے بعد محفل خواتین سے میری دلچسپی بہت کم ہو گئی تھی لیکن جناب عابد علی خاں مدیر سیاست، معتمد محفل خواتین محترمہ فاطمہ عالم علی خاں اور شریک معتمد محفل خواتین مظفر النساء ناز کے اصرار پر تعاون کر رہا ہوں۔



شکرچی میموریل سوسائٹی (کل ہند مشاعرے)

اگرچہ کہ میں شکرچی میموریل سوسائٹی کا رکن نہیں ہوں لیکن جناب عابد علی خاں کی خواہش پر سوسائٹی کے پہلے مشاعرہ ہی سے وابستہ ہوں۔ اس سوسائٹی کے زیر اہتمام تاحال ۶۶ کل ہند مشاعرے ہو چکے ہیں، جس طرح ادبی ٹرسٹ کے مشاعروں کے سلسلہ میں وقف ہو کر صرف اردو کی خدمت کے جذبہ سے کام انجام دیتے رہتے ہیں، اسی طرح سوسائٹی کے مشاعروں میں بھی میرا مکمل تعاون رہتا ہے۔

جناب اللہ سوسائٹی جناب عابد علی خاں کی مکمل نگرانی میں مشاعرے ہوتے رہتے ہیں۔ سوسائٹی کے ذمہ دار اصحاب جب میری بے لوث خدمات کا کھلے دل سے اعتراف کرتے ہیں تو میری ساری تھکن دور ہو جاتی ہے۔ سوسائٹی کے مشاعروں میں ملک بھر کے صنف اول کے شعراء شرکت کرتے ہیں۔ جناب محی الدین جیلانی سوسائٹی کے سکریٹری ہیں۔ یہ مشاعرے ہر سال ممتاز عثمانین جناب شکرچی کی بادی میں نمائش میدان میں

منعقد ہوتے ہیں۔ ان کے فرزند مسٹر شریدر اور ان کے دو بہترین دوست
 محی الدین حبیلانی اور کے۔ ایس۔ ریڈی نے شکر جی کی خدمات کو خراج پیش
 کرنے کے لئے سوسائٹی کی بنیاد رکھی اور مشاعروں کا آغاز کیا۔ (شکر جی جامعہ عثمانیہ
 کے پھوتوں میں سے ایک تھے اور جنھیں اُردو شعر و ادب سے بے حد دلچسپی تھی)۔



انجمن ترقی پسند مصنفین

حیدرآباد میں انجمن ترقی پسند مصنفین کی بھی ایک اہم تاریخ رہی
 ہے۔ اس انجمن سے بہت سے ممتاز دانشور، شاعر و ادیب وابستہ رہے ہیں۔ انجمن
 کے احیاء سے پہلے ڈاکٹر حسینی شاہد انجمن کے معتمد عمومی تھے۔ ۷۱ سال کے قفل کے بعد
 ڈاکٹر حسینی شاہد سکریٹری انجمن نے ۱۱ جون ۱۹۸۷ء کو اُردو ہال میں حیدرآباد کے
 ادیبوں اور شاعروں کا ایک اجلاس طلب کیا۔ اس اجلاس میں ایک اڈپاک کمیٹی
 زیر سرپرستی ڈاکٹر راج بہادر گوڈ اور ڈاکٹر حسینی شاہد بنی۔ کنوینر کی حیثیت سے جناب
 راشد آذر کا اور شریک کنوینر کی حیثیت سے میرا انتخاب عمل میں آیا۔ اجلاس کی بڑی
 تعداد پر چاہتی تھی کہ میں کنوینر بنوں، پچنانچہ میرا نام مختلف دانشوروں نے پیش کیا
 لیکن میں نے ترجیحاً راشد آذر کا نام تجویز کیا۔ راشد آذر نے انکار کیا اور کہا کہ مجھ
 سے تنظیمی کام انجام دینا ممکن نہیں ہے۔ میں نے اصرار کرتے ہوئے کہا کہ آپ ہاں

۱۹۸۷

کچھ دیکھتے آئین کی ساری ذمہ داری میں سنبھال لوں گا۔ دو ماہ بعد جب ۷ مارچ جولائی کو انتخاب ہوئے تو ہم دونوں بلا مقابلہ دو سال کی مدت کے لئے معتمد اور شریک معتمد منتخب ہوئے۔ جب دو سال کے بعد ۲۹ جولائی ۱۹۸۹ء کو پھر انتخابات ہوئے تو اراکین نے ہم دونوں کو ان ہی عہدوں پر برقرار رکھا۔ عابد علی خاں مدیر سیاست، ڈاکٹر راج بہادر گوڑ اور ڈاکٹر صنی شاہد سرپرست بنے، جناب عاتق شاہ صدر کی حیثیت سے منتخب ہوئے۔ عمر مہ نجر نکمت اور جناب رحمن باقی نائب صدور، جناب رئیس اختر معتمد نشر و اشاعت اور جناب گیان سنگھ شامڑ خازن مقرر ہوئے۔ زائد از ۴ برس سے انجمن ترقی پسند مصنفین نہایت پابندی سے کام کر رہی ہے۔ ابتداء میں انجمن کے جلسے ابوہال میں ہوا کرتے تھے لیکن اردو ہال میں سامعین کی تعداد حوصلہ افزاء نہیں تھی جس کی وجہ سے ہنری مارٹن انسٹی ٹیوٹ میں جلسوں کا اہتمام کیا جا رہا ہے۔ انجمن کے جلسے پابندی کے ساتھ جیسے ہیں دوبارہ ہوتے ہیں۔ حیدر آباد کی یہ سہیلی ادبی انجمن ہے جس کے جلسے وقت پر شروع ہوتے ہیں۔ انجمن کی رکنیت کے لئے ہم نے کوئی خاص شرط نہیں رکھی لیکن اس بات کا خیال رکھا جاتا ہے کہ ایسا شخص رکن بنے جو زندگی کی مثبت قدروں کی پاسداری کرتا ہو۔

انجمن ترقی پسند مصنفین کی تشکیل جدید کے وقت بلا کسی ذہنی تحفظات کے ہر اس شاعر و ادیب کو انجمن میں شامل کرنا طے پایا جو نہ صرف روشن خیال ہو بلکہ جس کی تخلیقات میں زندگی کی عزارت ہو اور جس کے قلم میں اتنی طاقت ہو کہ وہ سچائی کی آواز کو بلا خوف و خطر بلند کر سکے۔ جب انجمن کا احیاء ہوا تو بعض انشوروں کا یہ خیال تھا کہ یہ انجمن زیادہ دنوں تک نہیں چل سکے گی۔ ہم نے انجمن

کو ذاتی جھگڑوں، غیر اصولی اور نزاعی باتوں سے دور رکھا ہے۔ ہماری انجمن کے جلسوں میں تخلیقات پر تنقید و تبصرہ کی روایت برقرار ہے۔ نہایت دوستانہ ماحول میں انجمن کے بچے کامیابی کے ساتھ منعقد ہوتے ہیں۔ راشد آئرن اور میرے مزاج میں ہم آہنگی ہے، کسی بھی تنظیمی مسئلہ پر اختلاف رائے نہیں ہوتا جس کی وجہ سے نہایت سکون کے ساتھ انجمن کی سرگرمیوں میں اپنا زیادہ سے زیادہ وقت دے رہا ہوں۔ قیام انجمن ہی سے انجمن کے تمام جلسوں کی کاروائی میں ہی چلتا ہوں۔ اخبارات کے لئے انجمن کی نیوز بنانے اور شائع کروانے کا انتظام کرنا میرے ہی ذمہ ہے۔ ہم نے اپنی بہترین اور غیر نزاعی کارکردگی سے اپنے اراکین کو اپنے اعتماد میں لے لیا ہے اس لئے اراکین نے کبھی بھی ہمارے موقع فیصلوں کی مخالفت نہیں کی۔ اردو کے نامور دانشور جب ہمارے شہر کو اپنے علمی و ادبی کام کے سلسلہ میں آتے ہیں تو مناسبت اور موزونیت کے لحاظ سے انجمن کی جانب سے ان کا غیر مقدم کیا جاتا ہے۔ موقعی تقاریب کے انعقاد کے بارے میں ہم دونوں فون پر مشورہ کرنے کے بعد جلسوں کے اصرام کو عملی شکل دیتے ہیں۔ انجمن کے صدر ممتاز افسانہ نگار جناب عاتق شاہ بھی انجمن کی سرگرمیوں میں اضافہ کے لئے مفید مشوروں سے نوازتے رہتے ہیں، وہ معتد اور شریک معتمد کی سرگرمیوں میں کبھی سائل نہیں ہوتے۔ ہم نے کبھی بھی اپنے اراکین کو شکایت کا موقع نہیں دیا۔

جب انجمن بنی تو بعض اصحاب کا یہ خیال تھا کہ یہ انجمن سابقہ انجمن ترقی پسند مصنفین کی، نہج پر چلتی رہے گی اور ترقی پسند مصنفین کے بارے میں جو متنازعہ باتیں ہیں، ہم ان کی حوصلہ افزائی کریں گے لیکن ہم نے ایسا نہیں کیا۔ ہم نے

کھلے ذہن اور قراغ دلی کے ساتھ انجمن کے دروازے پر اس شاعر و ادیب کیلئے کھلے رکھے جو ادب برائے زندگی کا قائل ہے۔ انجمن کی خبریں مقامی اخباروں، سیاست، منصف، رہنمائے دکن کے علاوہ حیات (زہلی)، ہماری زبان (دہلی) اور ملک کے دوسرے اردو اخبارات میں شائع ہوتی رہتی ہیں۔

ہم نے ۲۲ مارچ ۱۹۸۹ء کو انجمن کی سالانہ کانفرنس منعقد کی جس میں علی سردار جعفری، ڈاکٹر قمر رئیس اور راجو مسکیتہ کے علاوہ ممتاز دانشور سید عابد حسین (موجودہ سفیر برائے امریکہ) نے شرکت کی تھی۔ یہ کانفرنس نہایت کامیاب رہی۔ اس موقع پر ایک ادبی سو وینیر شائع کیا گیا تھا جس کا مدیر میں تھا۔ یقین ہے کہ انجمن کی سرگرمیاں اس طرح ابھائی منازلی طے کرتی رہیں گی۔ اگست ۱۹۹۱ء کو انجمن کے انتخابات ہوئے جس میں تیسری دفعہ شریک معتمد کی حیثیت سے میرا انتخاب عمل میں آیا۔



دیارِ ادب

دیارِ ادب ضلع ابیدہ (کرناٹک) کی ایک قدیم ادبی انجمن ہے جس کے بانی و صدر ممتاز شاعر جناب رئیس اختر ہیں۔ گزشتہ ۷۰ سال سے اس انجمن کی سرگرمیاں بے پیر رکھے بجائے حیدرآباد میں جاری ہیں۔ میں اس انجمن کا مشیر ہوں اور ممتاز شاعر جناب متان منظور معتمد عمومی ہیں۔ دیارِ ادب کی کارکردگی کا

اندر شہر کی دیگر اجتماعوں کے مقابلے میں بالکل مختلف ہے۔ اس انجمن کی جانب سے وقتاً فوقتاً بیرون ملک اور ملک کے ممتاز ذہل قلم حضرات کا خیر مقدم کیا جاتا ہے۔ اس انجمن کی جانب سے حسن چشتی (شکاگو) ڈاکٹر توفیق احمد (امریکا) جناب فضل الدین فضل، بخیر (امریکا) اور اندرون ملک میں مسٹر مہرا ای۔ جی۔ پی۔ شملہ کا خیر مقدم کیا گیا۔ اس انجمن کی ساری سرگرمیوں میں میری علی بدو جہد کا بڑا دخل رہتا ہے۔ مجلسوں کا اہتمام، تشہیر وغیرہ میرے ذمے رہتی ہے۔ ہم تینوں نہایت خلوص کے ساتھ اس انجمن کی کارکردگی کو پروان چڑھانے میں ہم خیال ہیں۔



جشن گوکندہ سوسائٹی

نیدر آباد کی (۴۰۰) سالہ جشن تقاریب کے سلسلہ میں دو سال قبل جشن گوکندہ سوسائٹی بن چکی ہے۔ جس کی سرپرست سابق گورنر شری مہتی کوہین جوشی تھیں، اس وقت ریاست کے موجودہ گورنر جناب کرشن کانت سوسائٹی کے سرپرست ہیں۔ نواب شاہ عالم خاں صدر، جناب عابد علی خاں کارگزار، سرپرست ہیں۔ مولانا دل نغم سکریٹری، صلاح الدین تیرتھ جوائنٹ سکریٹری اور غلام احمد خازن ہیں۔ ان کے علاوہ بعض ممتاز شخصیتیں اراکین کی حیثیت سے وابستہ ہیں، جن میں

قابل ذکر ڈاکٹر سی نارائن بیڈی وائس چانسلر تلنگا یونیورسٹی، پروفیسر نوینت راؤ وائس چانسلر جامہ عثمانیہ، جناب امجد علی خان سکریٹری نظامس ٹرسٹ، جناب سید تراب الحسن، جناب معظّم حسین، مسٹر وی وی شاستری ڈائریکٹر آٹا و خد مرید، جناب متوہر رام سکینہ، ایم چترنجن، آتشادت، بلقیس علامہ الدین وغیرہ ہیں۔ ان سوسائٹی کے قیام کے سلسلے میں سابقہ گورنر شریعتی کونڈمین جوشی نے تین سال قبل یوم قسلی قطب شاہ کے افتتاحی جلسہ میں یہ مشورہ دیا تھا کہ حیدرآباد کی (۴۰۰) سالہ جشن تقاریب منائی جائیں، انہوں نے عابد علی خاں صاحب اور ڈاکٹر موہن لال انم سے خواہش کی تھی کہ وہ اس سلسلہ میں ان سے ملیں۔ شروعات کچھ طور پر انہوں نے (۱۵) ہزار روپے عطیہ کا اعلان کیا تھا۔

سوسائٹی کی جانب سے تاحال دو بڑی تقاریب (کل ہند مشاعرہ) اور شبِ عزّی کا اہتمام کیا جا چکا ہے۔ یہ تقاریب مالیہ کے استحکام کے سلسلے میں منعقد کی گئی تھیں۔ ان دونوں تقاریب کے انعقاد کا سہرا جناب عابد علی خاں کی مشاورت اور ڈاکٹر نگم کی شخصی دلچسپی کے سر جاتا ہے۔ یہ دونوں تقاریب مسٹر پتھر نجن (ای۔ ٹی۔ ای) کے بھرپور تعاون سے منعقد ہوئیں۔ آئی ٹی اے نے ان دونوں پروگرامس کو اسپانسر کیا تھا، جس میں سوسائٹی کو ۳ لاکھ روپے ملے۔ خاص طور پر مشاعرہ کے انعقاد کے سلسلے میں صرف نگم صاحب اور میری شخصی دلچسپی رہی۔ تمام شعراء کو میں نے ہی مدعو کیا تھا، خط و کتابت کی اور ضروری انتظامات کئے لیکن یہ سب کچھ ڈاکٹر نگم کی مشاورت اور تعاون سے ممکن ہو سکا۔ کل ہند مشاعرہ ۱۸ اکتوبر ۱۹۸۹ء کو قسلی قطب شاہ اسٹیڈیم میں منعقد کیا گیا جس میں ملک کے نامور

شعراء ڈاکٹر گوپال داس نیرج، بیکل اہتاہی، ڈاکٹر اسمن رموی، پروفیسر آزاد گانی نے بھی شرکت کی تھی۔ اس مشاعرہ میں ۱۸ بیرونی شعراء کو مدعو کیا گیا تھا۔ دوسرا پروگرام شب غزل کا تھا جو رویندر ابھارتی تھیٹر میں جنوری ۱۹۹۹ء میں ہوا۔

پاکستان کے نامور گلوکار غلام علی کو مدعو کیا گیا تھا۔ سوسائٹی کی جانب سے سال بھر کا پروگرام ترتیب دیا ہی جا رہا تھا کہ گورنر صاحبہ نے راج بھون میں ایک میٹنگ طلب کی اور یہ تجویز رکھی کہ جب حکومت نے جشن منانے کا اعلان کیا ہے تو بہتر یہ ہے کہ سوسائٹی کے کچھ اراکین چیف منسٹر صاحب (ڈاکٹر ایم چناریڈی) سے مل لیں اور جشن کی صورت گری کے بارے میں معلومات حاصل کریں اور اپنا تعاون پیش کریں۔ چنانچہ ملے پایا کہ جناب عابد علی خاں، نواب شاہ عالم خاں اور ڈاکٹر نگم چیف منسٹر صاحب سے مل لیں۔ اس سلسلے میں سوسائٹی کے اراکین نے حکومت کے نمائندہ جناب نریندر لوتھر صاحب سے ملاقاتیں کیں، ڈو، مین میٹنگس بھی ہوئیں۔ چیف منسٹر صاحب نے مشاورت کے لئے ایک بڑے اجلاس کا اہتمام کیا تھا، لیکن جشن کے افتتاح کی قطعی تاریخ مقرر نہ کی جاسکی۔ پھر آندھرا علاقہ میں طوفانِ باد و باراں اور دیگر انتشاری حالات کی وجہ سے کوئی پیش رفت نہ ہو سکی۔ حکومت کا یہ خیال تھا کہ جنوری ۱۹۹۹ء سے تقاریب کا آغاز کیا جائے لیکن شہر میں فسادات کی وجہ سے حکومت بدل گئی اور یہ ممکن نہ ہو سکا۔ جشن کے کام کو آگے بڑھانے کے لئے ۲۲ دسمبر کو ۱۰ بجے دن راج بھون میں ایک تعارفی اور مشاورتی اجلاس منعقد ہوا جس کی صدارت گورنر آندھرا پردیش جناب کرشن کانت نے کی۔ اراکین کی خواہش پر گورنر صاحب نے سوسائٹی کی سرپرستی قبول کی۔ یہ ملے پایا کہ جشن کی

تقاریب، کا آغاز سوسائٹی کی جانب سے اپنے طور پر کیا جائے، اور حکومت کی تقاریب میں بھی تعاون کیا جائے۔ معلوم ہوا ہے کہ حکومت جلد ہی تقاریب کا آغاز کرنے والی ہے۔ لیکن پتہ نہیں وہ خوش نصیب دن کون سا ہوگا۔



مشاعرہ دکن

کئی برسوں سے ادبی حلقوں میں یہ بات شدت سے محسوس کی جا رہی تھی کہ ایسے ممتاز شعراء جو ریاستوں کی تقسیم سے پہلے حیدرآباد دکن سے تعلق رکھتے تھے اور ایسے ممتاز شعراء جو آندھرا پردیش کے اضلاع میں نمایاں مقام رکھتے ہیں، انہیں حیدرآباد کے مشاعروں میں مدعو کیا جاتا رہے۔ اس جذبہ کو پیش نظر رکھتے ہوئے ۱۹۸۹ء سے زیر سرپرستی بھابھو آزادی ہند سابق وزیر اطلاعات حکومت آندھرا پردیش جناب کوئڈہ لکشمیناپاوجی، مشاعرہ کا آغاز کیا گیا۔ مشاعرہ دکن کے انعقاد کے سلسلے میں جناب کوئڈہ لکشمیناپاوجی نے مجھ سے ایک ملاقات میں کہا تھا کہ میں عبدالرفضان کے موقع پر قومی یکجہتی کو پروان چڑھانے اور حیدرآبادی تہذیب کو خراج پیش کرنے کے لئے ہر سال ایک نمائندہ مشاعرہ کرنا چاہتا ہوں۔ حیدرآباد کی گنگا جمنی تہذیب کی دیرینہ روایات کی تجدید کے لئے میں نے یہ قدم اٹھایا ہے۔ میں اس سلسلے میں ایک ٹرسٹ بھی بنانا چاہتا ہوں، جس میں آپ کا

تعاون درکار ہے۔ مشاعروں کے انعقاد کی ساری ذمہ داری آپ پر رہے گی۔ اور آپ مشاعرہ دکن کے مستقل معتمد بنیں گے۔

میں نے کوئٹہ لکھنؤ بامپور جی کے اس جذبہ کو عملی جامہ پہنانے کے لئے اس بہتر اور مفید کام میں دلچسپی لینا شروع کیا۔ چنانچہ مشاعرہ دکن کا پہلا مشاعرہ ۸ مئی ۱۹۸۹ء کو عید رمضان کے دوسرے دن حسین ساگر کے پُر فضا کنارے پر شاندار پیمانے پر منعقد کیا گیا جس کی صدارت جناب عابد علی خان نے کی، مہمان خصوصی کی حیثیت سے جسٹس سردار علی خاں جج آئندھرا پردیش ہائی کورٹ نے شرکت کی تھی۔ اس مشاعرہ میں سابق ریاست حیدرآباد اور آئندھرا پردیش کے اضلاع کے شاعروں کے علاوہ حیدرآباد کے اردو، ہندی، تلوگو کے نمائندہ شاعروں کو مدعو کیا گیا تھا۔ اس مشاعرہ میں اضلاع کے ۲۵ نمائندہ شاعروں نے شرکت کی تھی۔ مشاعرہ دکن کا دوسرا مشاعرہ ۱۲ مئی ۱۹۹۰ء کو منعقد ہوا جس کی صدارت جناب عابد علی خان نے کی۔ اس مشاعرہ میں شعراء کا ستملان کرتے ہوئے انہیں محمد قلی قطب شاہ کی تصویر کے خوبصورت اسپیچ پر مبنی نرمل انڈسٹری کا تیار کردہ مومنٹو پیش کیا گیا۔ اس مشاعرہ کو ۴۰ سالہ جشن حیدرآباد سے منسوب کیا گیا۔ مشاعرہ کے انعقاد کا ایک واضح مقصد یہ ہے کہ حیدرآباد کی تہذیبی روایات کی جس کو سارا ملک رشک کی نگاہوں سے دیکھتا ہے، پاسداری کی جائے اور نئی نسل کو یہ بتایا جائے کہ ان کے اسلاف کس طرح گنگا جمنی ماحول میں رہتے تھے۔

ان مشاعروں کی وجہ سے حیدرآباد میں ایک خوشگوار فضا نے جنم لیا ہے۔ مشاعروں میں ہندی تلوگو کے نمائندہ شاعروں کے ساتھ ساتھ بعض باصلاحیت نئے

شاعروں کو بھی مدعو کیا جاتا ہے تاکہ انہیں یہ احساس نہ ہو کہ اُن کی صلاحیتوں کو نظر انداز کیا جا رہا ہے۔

تیسرا مشاعرہ دکن ۲۴ مئی ۱۹۹۱ء کا شب جمودریشم میں منعقد ہوا۔ گورنر آندھرا پردیش، جناب کرشن کانت نے افتتاح کیا اور تمام (۶۰) شاعروں کو مومنٹو پیش کئے۔ جناب عابد علی خان نے صدارت کی۔ مہمانانِ خصوصی میں جسٹس سردار علی خاں، ڈی۔ رامارنج راؤ، ڈاکٹر سید عبدالملتان اور جناب منوہراج مکین شامل تھے۔



اولڈسٹی یوتھ فیسٹول

حکومت کی سطح پر زیر اہتمام قسلی قطب شاہ اربن ڈیولپمنٹ اتھارٹی ۲۴، ۲۵ مارچ ۱۹۹۰ء کو قسلی قطب شاہ اسٹیڈیم میں شاندار پیمانے پر اولڈسٹی یوتھ فیسٹول منایا گیا، جس کا میں سکریٹری مقرر کیا گیا۔ گیان پیتمہ ایوارڈ یافتہ تلگو کے عظیم شاعر پدم شری ڈاکٹر سی نارائن ریڈی وائس چانسلر تلگو یونیورسٹی، فیسٹول کے مشیر اعلیٰ تھے۔ مجھے سکریٹری مقرر کرنے میں اُن کی شخصی دلچسپی کو دخل رہا ہے۔ مسٹر نرسیمہ راؤ ڈائریکٹر کلچرل ایفرس، اڈوائزر اور مسٹر کے۔ رمنہا چاری آئی اے ایس، ایڈمنسٹریٹر قسلی قطب شاہ اربن ڈیولپمنٹ

اتھارٹی اعزازی چیئرمین تھے۔ پروگرام کد بہتر انجام دہی کے لئے میں نے مختلف شعبوں کی سب کمیٹیاں بنائیں۔ ڈاکٹر صادق نقوی، سمینار کے اپنا راج رہے۔ خواجہ بہار الدین اور اسلم فرشتوری شعبہ موسیقی اور کلچرل ونگ کے کنوینرس تھے۔ رئیس اختر اور نیہپال سنگھ ورما مشاعرہ کے کنوینرس رہے۔ ہر مارچ کی شب اردو ہندی کاشت انداز مشاعرہ زیر مہارت جناب عابد علی خاں منعقد کیا گیا تھا جس میں اردو، ہندی کے ۲۸ نامور و نامندہ شاعروں نے کلام سنایا۔ ان تمام شاعروں کا سنہن کیا جا کر انہیں ایک یادگار مونسٹو دیا گیا اور شال اوڑھائی گئی۔ جناب تاج الدین سکریٹری اربن ڈیولپمنٹ اتھارٹی، فیٹول کے خازن تھے، جنہوں نے پروگرام کے انتظامات میں مکمل تعاون کیا۔ یہ فیٹول فیروز آباد کے ایک صنعتی منعقد ہونے والا تھا لیکن میرے بیرون ملک سفر کی وجہ سے (۴۰ سالہ جشن حیدر آباد تقاریب جدہ) ملتوی کیا جا کر مارچ میں رکھا گیا۔ ڈاکٹر سی نارائن ریڈی اور مسٹر منا چاری چاہتے تھے کہ پرانے شہر کا یہ فیٹول میری موجودگی میں ہو۔ سہ روزہ تقاریب اعلیٰ پیمانے پر منائی گئیں۔ پرانے شہر میں اس فیٹول کے انعقاد کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ پرانے شہر کے لوگ جو نئے شہر کے تہذیبی مراکز پر مشکل سے پہنچ پاتے تھے ان کے حقوق کی تکمیل ہو۔ میں نے اپنی خیر مقدمی تقریر میں کہا تھا کہ جب تک ہمارے شہر میں ڈاکٹر سی۔ نارائن ریڈی اور مسٹر منا چاری جیسے سکولر و تہذیبی لوگ موجود ہیں ہمارے شہر میں اس قسم کی مقصدی شعری، تہذیبی و ادبی تقاریب منعقد کی جاتی رہیں گی۔ میں نے لسانی ہم آہنگی کے جذبہ کو فروغ دینے کیلئے مشاہیر میں اردو شاعروں کو مدعو کرنے کیلئے نیہپال سنگھ ورما سے خواہش کی اور ہندی شاعروں کو کلام سناتے کیلئے رئیس اختر سے کہا تھا۔

میرا شہر میرے لوگ

”میرا شہر میرے لوگ“ ایک ادبی و تہذیبی ادارہ ہے جس کی سرگرمیوں کا آغاز حکومت آندھرا پردیش کے شعبہ تہذیبی و ثقافتی امور اور خاص طور پر ڈائریکٹر پبلک افرس مسٹر ویلنٹ رمنایاری کی شخصی دلچسپی کی وجہ سے اردو، ہندی کے ملے جلے مشاعرہ سے ہوا، جو ماہ مئی ۱۹۹۱ء کی شب، مال ولا پیالیس میں منعقد ہوا تھا۔ جناب عابد علی خان میریاست نے صدارت کی تھی۔ اس مشاعرہ میں اردو، ہندی کے نمائندہ شاعروں کا سہماں کیا جا کر انہیں شال اور صالی گئی۔ اس ادارہ کے قیام کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ اس کی جانب سے شہر میں وقتاً فوقتاً ادبی و تہذیبی تقاریب منعقد کی جاتی رہیں۔

اس ادارہ کی جانب سے عارف قریشی (جمدہ) کے اعزاز میں بمقام طارق منزل، نورخاں بازار، ایک یادگار مشاعرہ ہوا جس میں اردو، ہندی کے نمائندہ شاعروں نے کلام سنایا۔ ڈاکٹر حسن الدین احمد صدر نشین اقلیتی کمیشن جہان پور خصوصی تھے۔ جناب امیر احمد خسرو نے صدارت کی تھی۔ اس مشاعرہ کا ویڈیو کیسٹ تیار کیا گیا۔ معتمدی کے قرائن میں نے انجام دیئے۔

ادارہ کی دوسری تقریب حیدرآباد کے ایک کلمہ شوق استاد شاعر

جناب مسعود صدیقی کی یاد میں کہ مولانا ابوالکلام آزاد ریسرچ انسٹیٹیوٹ
 میں مستعد ہوئی، جس کی صدارت جناب راشد آذر نے کی تھی جبکہ مہمان خصوصی
 کی حیثیت سے مسز امیر احمد خسرو، رئیس اختر، رحمن جانی اور شاہہ صدیقی
 ساتھ (کنفیڈ) نے شرکت کی تھی۔ مال ولایہ پالیس کے مشاعرہ کی طرح اس
 تقریب کا بھی میں کنوینر تھا۔ اجلاس کے بعد مشاعرہ ہوا جس میں مشہر کے
 نمائندہ شعراء نے کلام سنایا تھا۔

۱۶ ستمبر ۱۹۹۱ء کو اس ادارہ کی جانب سے بہ تعاون محکمہ تہذیبی
 و ثقافتی امور حکومت سندھ پیردیش، رویندرابھارتی میں اعلیٰ پیمانے پر
 "شیم غزل" کا اہتمام کیا گیا تھا، جس کی صدارت ڈاکٹر سید عبد المنان
 نے کی جبکہ مہمانان خصوصی کی حیثیت سے ڈاکٹر محمد بن لال نگم اور جناب مسعود
 نے شرکت کی۔ ممتاز گلوکار ڈاکٹر جگدیش کپور گرام انچارج تھے۔ مسز
 حمایت اللہ اور خواجہ بہاء الدین معاون انچارج، صلاح الدین نیر سکریٹری/کنوینر
 شام غزل اور جناب رئیس اختر معاون تھے۔ ڈاکٹر جگدیش کد، دیوی
 رتن مورتی، مالا باریہ، کلیم خاں اور خاتن اطہر نے حیدرآباد کے بقیہ حیات
 نمائندہ شعراء کا کلام سن کر داد و تحسین حاصل کی۔ جناب اسلم فرشتوری نے
 نظامت کے فرائض انجام دیے۔ ابتداء میں راقم الحروف نے غیدہ مقدسی
 و تعارفی تقریر کی۔



شعری مجموعے

اب تک میرے (۸) شعری مجموعے شائع ہو چکے ہیں، جن کی تفصیل یہ ہے
 گل تازہ (۱۹۶۵)، 'زخموں کے گلاب' (۱۹۷۲)، 'صنم تراش' (۱۹۷۸)،
 شکن در شکن (۱۹۷۹)، 'خوشبو کا سفر' (۱۹۸۳)، 'رشتوں کی ہلک' (۱۹۸۶)،
 سفر جلدی ہے (۱۹۸۸)، 'یہ کیسا رشتہ ہے' (۱۹۹۰)۔

"سفر جاری ہے" میں میری (۳۵۰) منتخب غزلیں شامل ہیں۔ اس
 مجموعے میں میرے پہلے مجموعوں میں شامل منتخب غزلوں کے علاوہ کچھ نئی غزلیں
 بھی شریک ہیں۔ بہت سی پچھلی غزلوں پر میں نے نظر ثانی بھی کی ہے۔
 اسی طرح "یہ کیسا رشتہ ہے" میں منتخب نعتیں، ایک فارسی منقبت کے علاوہ
 مختلف موضوعات پر نظمیں شریک ہیں۔ یہ مجموعہ ۳۹۲ صفحات پر مشتمل ہے
 اس مجموعہ میں میری تمام شانہ زندگی کی منتخب مطبوعہ نظموں کے علاوہ چند غیر
 مطبوعہ نظمیں بھی شامل ہیں۔ میرے کام کا ایک اور مجموعہ زیر ترتیب ہے۔

پہلے مجموعہ کے نام "گل تازہ" کی منتخب غزلوں پر مشتمل تلگو منظوم مجموعہ
 "نیشہ گلستان" کے نام سے پورا تمام ماہیتہ ریہ پشہ نظم ۱۹۶۵ء میں شائع ہوا
 اس کا منظوم ترجمہ بناتہ شمس الدین مودی نے کیا ہے۔ یہ کتاب ممتاز شاعر
 کتاب پبلیکیشنز، ممبئی کے ایڈیٹر کی خصوصی دلچسپی سے شائع ہوئی تھی۔

نشری کتابیں اور شعری مجموعے

ترتیب و ترتین

- ۱۔ عظمتِ غزل (عظمتِ عبدالقیوم، فن اور شخصیت) (مرتبہ صلاح الدین نیئر) ۱۹۸۸ء
- ۲۔ عظمتِ خیاباں (عظمتِ عبدالقیوم) مضامین، افسانے، شاعری، خطوط اور
مستقرن تحویلیں (مرتبہ: صلاح الدین نیئر) ۱۹۸۹ء
- ۔۔ نرینگرانی شائع شدہ کتابیں ۔۔
- ۱۔ اُردو ادب میں خاکہ نگاری - ڈاکٹر صابرہ سعید - ۱۹۶۹ء
- ۲۔ ارمغانِ اختر (شاعری) اختر فاروقی - ۱۹۷۵ء
- ۳۔ ادبی میگزین (سکریٹریٹ اُردو اسوسی ایشن) - ۱۹۷۶ء
- ۴۔ بہارِ غزل (شاعری) - اقبال حسین اقبال - ۱۹۷۹ء
- ۵۔ گھر کی دیوار - (افسانے) انیس قیوم فیاض - ۱۹۸۰ء
- ۶۔ حیدر آباد میں اُردو افسانہ نگاری - انیس قیوم فیاض - ۱۹۸۰ء
- ۷۔ آل احمد سرور اور ادبی خدمات - عبدالنساء - ۱۹۸۰ء
- ۸۔ جانِ غزل - (شاعری) - اقبال حسین اقبال - ۱۹۸۰ء
- ۹۔ جامِ کوثر - (شاعری) - اقبال حسین اقبال - ۱۹۸۱ء
- ۱۰۔ زخمِ بولتے ہیں (شاعری) - ہیرالال موریہ - ۱۹۸۲ء
- ۱۱۔ یسگوانِ رام (اجودھیا کھاٹہ) (شاعری) - ہیرالال موریہ - ۱۹۸۳ء

- ۱۲۔ حیدرآباد کے علمی و ادبی ادارے۔ - شفیق قادری ۱۹۸۳ء
- ۱۳۔ بات پھولوں کی (شاعری)۔ - مظفر النساء ناز ۱۹۸۳ء
- ۱۴۔ پسِ دیوارِ شب (شاعری)۔ - سکندر محسن ۱۹۸۴ء
- ۱۵۔ تعارف (مضامین)۔ - شفیق قادری ۱۹۸۵ء
- ۱۶۔ بھگوان رام (آریہ کھانڈ) (شاعری) ہیرالال موریا ۱۹۸۶ء
- ۱۷۔ سوزِ قمر (شاعری)۔ - انجم قمر سوز ۱۹۸۶ء
- ۱۸۔ ادبی میگزین (انجمن ترقی پسند مصنفین)۔ ۱۹۸۹ء
- ۱۹۔ پہچان (شاعری)۔ - کویت کرن ۱۹۸۹ء
- ۲۰۔ رامائن۔ - یدھ کھانڈ ہیرالال موریا ۱۹۹۱ء

شعری مجموعوں پر انعامات

- ۱۔ زمنوں کے نگار۔ - اترپردیشی اُردو اکیڈمی ۱۹۷۳ء
- ۲۔ شمعِ درِ شمع۔ - آندھرا پردیش اُردو اکیڈمی ۱۹۸۰ء
- ۳۔ خوشبو کا سفر۔ اترپردیش اُردو اکیڈمی، بہار اُردو اکیڈمی، آندھرا پردیش اُردو اکیڈمی { ۱۹۸۴ء
- ۴۔ رشتوں کی مہک۔ - اترپردیش اُردو اکیڈمی، بہار اُردو اکیڈمی، آندھرا پردیش اُردو اکیڈمی { ۱۹۸۷ء

- ۵۔ سفر جاری ہے۔ اتر پردیش اُردو اکیڈمی، منترلی بنگال اُردو اکیڈمی
اُردو اکیڈمی آندھرا پردیش - ۱۹۸۹ء
۶۔ یہ کیسا رشتہ ہے اُردو اکیڈمی آندھرا پردیش ۱۹۹۰ء

شعری ادبی و تہذیبی خدمات کے اعتراف میں اعزازات

- ۱۔ پدمشری ایوارڈ - آندھرا پردیش کلچرل اسوسی ایشن سکریٹریٹ۔ ۱۹۶۷ء
- ۲۔ پدمشری آف انگریزیشن ایوارڈ - ضلع گردھالیہ سمسٹھا تھم۔ ۱۹۸۲ء
- ۳۔ یونٹی ایوارڈ - یونائٹڈ ہندو مسلم فرنٹ، حیدرآباد۔ ۱۹۸۵ء
- ۴۔ نیشنل انگریزیشن ایوارڈ - بھارتیہ کلچرل اکیڈمی، آندھرا پردیش۔ ۱۹۸۸ء
- ۵۔ شان حیدرآباد ایوارڈ - حبیب آباد آرٹس اینڈ لیچرن سوسائٹی۔ ۱۹۸۸ء
- ۶۔ قلی قطب شاہ ایوارڈ - (مونٹو) اولڈ سٹی یوتھ فیئول۔ ۱۹۹۰ء
- ۷۔ مشاعرہ دکن ایوارڈ - (مونٹو) مجاہد آزادی کونڈا انکشن بابو جی۔ ۱۹۹۱ء
- ۸۔ مشاعرہ دکن ایوارڈ - (مونٹو) مجاہد آزادی کونڈا انکشن بابو جی۔ ۱۹۹۱ء
- ۹۔ فخر الدین عسلی احمد قومی بکچر ایوارڈ۔ ۱۹۹۱ء

عولہ بالا ایوارڈز کے علاوہ حکومت آندھرا پردیش کی جانب سے مختلف تقاریب اور مشاعروں کے موقع پر کئی مرتبہ سہمان کیا گیا، شمال اور وسطی سرٹیفیکٹس دیئے گئے اور جھے مونٹو پیش کئے گئے۔

ملک اور بیرون ملک کے مشاعرے
اور دیگر تفصیلات

دوسرے قطر میں یہ نشست اسٹیشن خلیفہ بن حمد الشانی کے ۷۰ ویں یوم جلوس کے موقع پر ۷ مارچ ۱۹۸۵ء کو دوسرے قطر میں مشاعرہ منعقد ہوا تھا جس میں تیسرا بانی نمائندگی میں نے کی تھی۔ ملک کے شاعروں میں علی سردار جعفری، کیفی اعظمی، حفیظ سیرٹھی، شمس الرحمن فاروقی، ملک زادہ منظور، وسیم بریلوی کے علاوہ پاکستان کے نامور شاعر حمایت علی شاعر اور منور ہاشمی نے شرکت کی تھی۔ مشاعرہ کے دوسرے دن دوسرے قطر ریڈیو اسٹیشن میں بھی مشاعرہ منعقد ہوا تھا جس میں تمام یہاں شعرا نے بھام سنایا تھا۔

جس نے اس وقت حیدرآباد کی (۴۰۰) سالہ جشنِ تقاریب کے سلسلے میں زیرِ اہتمام (۴۰۰) سالہ جشنِ حیدرآباد کی کئی جگہ ۴۰۰ فروری تا ۴۰۰ فروری ۱۹۹۹ء اقتباس
جلسہ: سینا پبلک پریگرام اور مشاعرہ منعقد کیا گیا تھا۔ مشاعرہ میں میر تقی میر، علامہ
اسرارِ حمایت اللہ، مصطفیٰ علی بیگ، یوگس حیدرآبادی، علی الدین نوید، طالب
خوندمیری، نریندر لوتھر، رام سوامی اور صبغتہ اللہ بیٹا نے کلام سنایا۔
جناب عابد علی خان مدیر سیاست کی صدارت میں مشاعرہ ہوا۔ جہاں خصوصی کی
حیثیت سے جناب محبوب حسین جگر جو انٹ ایڈیٹر سیاست نے شرکت کی تھی۔
افتتاحی جلسہ اجلاس کو جناب سلطان صلاح الدین اولیٰ صدر کل ہند مجلس اتحاد المسلمین

ایم پی۔ جناب عابد علی خاں، جناب سید ہاشم علی اختر سابق وائس چانسلر
مسلم یونیورسٹی علی گڑھ اور نیشنل یونیورسٹی آف ایس۔ اور جناب طارق غازی وغیرہ
مخاطب کیا۔

۱۹۹۰

سیاحی۔ حیدرآباد کی ۴۰ سالہ جشن تقاریب کے سلسلے میں ۶ فروری
کو سیاحی میں مقیم حیدرآبادیوں کی جانب سے ریگڑ تھا۔ یہ ایک علاوہ مشاعرہ بھی
منعقد کیا گیا تھا، جس میں میرے علاوہ سرز حمایت اللہ، طالب غوند میری
مصطفیٰ علی بیگ اور بوگس حیدرآبادی نے شرکت کی تھی۔ صدارت جناب
سید ہاشم علی اختر نے کی تھی۔

کویت۔ کویت میں مقیم حیدرآبادیوں کے تعاون سے حیدرآباد کی
۴۰ سالہ جشن تقاریب کے سلسلے میں جشن حیدرآباد کمیٹی کویت کی جانب سے
۸ مارچ ۱۹۹۰ء کو جشن کا اہتمام کیا گیا تھا۔ اس سلسلے میں مشاعرہ بھی
منعقد ہوا تھا، جس کی صدارت جناب عابد علی خاں میر سیاست نے کی۔
جہاں خصوصی کی حیثیت سے صدر کل ہند مجلس اتحاد المسلمین جناب سلطان صلاح اللہ
ایسی نے شرکت کی تھی۔ مشاعرہ میں میرے علاوہ سرز حمایت اللہ، مصطفیٰ علی
بیگ، ڈاکٹر موہن لال نگم، خواہ مخواہ (بمبئی) نے شرکت کی تھی۔ ان تقاریب کے
روح رواں جناب ہوشیار شاہ تھے۔



زائر۔ ۳۰ سال سے کل ہند مشاعرے پڑھ رہا ہوں۔ میں نے حیدرآباد میں

پہلا کل ہند مشاعرہ ۱۵ دسمبر ۱۹۵۹ء میں یڑھاتھا، جو حیدرآباد کلچرل سوسائٹی کی جانب سے گاندھی جیون میں منعقد ہوا تھا، جس کے کنوینر انجمن حیدرآبادی تھے۔ مشاعرہ میں شہنا گوئیاری، شکیل بدایونی، انور مرزا پوری اور حسرت جے پوری نے شرکت کی تھی۔ دوسرا کل ہند مشاعرہ نمائش ٹکراؤنڈ میں ۱۶ مئی ۱۹۶۰ء کو منعقد ہوا تھا۔ اس مشاعرہ کے کنوینر بھی انجمن حیدرآبادی تھے۔ مخدوم محی الدین صاحب نے مشاعرہ کی صدارت کی تھی۔ مہمان شعراء میں شکیل بدایونی، راز الہ آبادی اور شعری بھوپالی شامل تھے۔ حیدرآباد کے شاعروں میں میں بھی شامل تھا۔

بزم ادب اردو کالج کے زیر اہتمام ۱۹۶۰ء میں کل ہند مشاعرے کے سلسلے میں آئے ہوئے شاعروں کے اعزاز میں مشاعرہ ہوا تھا، اس مشاعرہ میں، ان نے بھی کلام سنایا تھا۔

نظام کلب کے احاطہ میں "شب قہقہہ" کے نام سے مشاعرہ ہوا تھا، اس کی صدارت شاہد صدیقی صاحب نے کی تھی۔ میں اس مشاعرہ کا منعقد تھا۔



"بزم سخن" محبوب نگر، کی جانب سے ۲۰ جنوری ۱۹۶۲ء کو کل ہند مشاعرہ منعقد ہوا تھا، جس میں حسرت جے پوری اور میتا قاضی نے بھی شرکت کی تھی۔ حیدرآباد کے زائد از ۱۵ شاعر اس مشاعرہ میں مدعو تھے۔ اس مشاعرے میں میں نے بھی شرکت کی تھی۔ ان مشاعروں کے علاوہ میں نے کئی اور کل ہند مشاعرے یڑھے ہیں۔ ادبی ٹرسٹ، شنکر جی میموریل سوسائٹی اور شہر میں منعقد

تمام کل ہند مشاعروں میں، میں نے کلام سنایا ہے۔ ملک کے جن اہم شہروں میں، میں نے کل ہند مشاعرے پڑھے ہیں، ان کے چند نام یہ ہیں۔ 'دلی'، 'بمبئی'، 'دراسن'، 'لکھنؤ' (فیض آباد)، 'بھیوانی' (ہریانہ)، 'بھوپالی'، 'بنگلور'، 'جمشید پور' وغیرہ۔ ان مقامات کے علاوہ ملک کے کئی اور مقامات پر مشاعرہ پڑھ چکا ہوں۔



میں نے ریاست آندھرا پردیش اور سابق ریاست حیدرآباد کے تقریباً تمام اضلاع کے مشاعروں میں کلام سنایا ہے۔ اضلاع کے مشاعرے زائد از (۳۰) سال سے پڑھ رہا ہوں۔

گذشتہ (۳۰) برسوں سے آل انڈیا ریڈیو سے میرا کلام نشر ہو رہا ہے کئی فیچرز اور تقاریر بھی نشر ہوئی ہیں۔ گذشتہ چھ سال سے دور درشن کیندر حیدرآباد کے علاوہ نیشنل پروگرام (نٹ ورک) میں بہ حیثیت شاعر شرکت کرتا رہا ہوں۔ شہر کے حالیہ بھیانک فسادات کے موقع پر دورانِ کرفیو میں دور درشن سے امن کی اپیل کی تھی۔ ریکارڈنگ کے لئے اسٹاف میرے گھر آیا تھا۔

حیدرآباد کے مختلف اداروں اور انجمنوں کی جانب سے خاص خاص مواقع پر شہر میں جتنے بھی مشاعرے ہوتے رہے ان میں کلام سناتا رہا ہوں۔ ان میں سے بیشتر مشاعروں کے انعقاد کی ذمہ داری بھی کسی نہ کسی طرح مجھے سونپی جاتی تھی۔ جب میں اردو کالج کا طالب علم تھا، اُس زمانے میں شہر کے مختلف کالجس کے مشاعروں کے انعقاد کے سلسلے میں تعاون کیا کرتا تھا۔ ان کالجس کے قابلِ ذکر

یہ نام ہیں۔ نظام کالج ، وینس کالج (کوٹلی) ، طبیبہ کالج ، یونیورسٹی کالج ،
انوار العلوم کالج ، بینکلی راماریڈی وینس کالج ، وینتہا ہاؤس دیا لہ اور
آرٹس کالج جامعہ عثمانیہ ۔

حکومت کی سطح کے ان مشاعروں کا نہ صرف میں نے اہتمام کیا ہے بلکہ
بیشتر مشاعروں کی نظامت کے فرائض انجام دیئے ہیں۔ گورنرس ، چیف منسٹرز
اور وزراء کی جانب سے منعقدہ مشاعروں کی معتمدی کے فرائض بھی انجام
دیئے ہیں۔

اضلاع کے سرکاری مشاعرے ہوں کہ غیر سرکاری مشاعرے یا ادبی
انجمنوں کی جانب سے منعقدہ مشاعرے ہوں۔ حیدرآباد کے زیادہ تر شاعر
میری پسند اور میری فہرست کی روشنی میں شرکت کرتے ہیں۔ تقریباً ۳۰
سال سے اضلاع کے مشاعرے پڑھ رہا ہوں۔ اضلاع کے اہم مشاعروں کی
زبرداری بھی کسی نہ کسی طرح مجھے ہی سونپی جاتی ہے۔ مہاراشٹر کے مشاعروں کو
اپنے ہمراہ لے دیتا ہوں ، جن کی شرکت مشاعرے کی کامیابی کی ضامن سمجھی جاتی ہے
جب میں شروع شروع اضلاع کے مشاعرے پڑھتا تھا تو اُس زمانے میں یہاں
شاعروں کے لئے بادہ و ساغر کا انتظام نہ ہوتا تھا لیکن میں نے شراب کے بجائے
شعراء کو معاوضہ دلانا شروع کیا۔ یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے۔



میں مشاعروں کی صدارت سے محروم ہوں ، پھر بھی بعض خاص خاص
مشاعروں کی میں نے صدارت کی ہے جن میں سے صرف دو مشاعروں کا ذکر کرنا چاہتا ہوں۔

کل ہند مشاعرہ نانڈیٹر (مہاراشٹر) جو میونسپل کاپوریشن کی جانب سے ۱۹۹۱ء میں منعقد ہوا تھا، جس میں ملک کے ممتاز شعراء نے شرکت کی تھی جن میں قابل ذکر نام یہ ہیں۔ نثار بارہ بکوی، والی آسی، راحت اندوری، میر ہاشم علی۔ بشر نواز، وغیرہ۔

حیدرآباد کرناٹک کی ممتاز شاعرہ صغریٰ عالم کے پہلے مجموعہ کلام حیطہ فنی سم اجراء کی تقریب کے سلسلے میں ۱۸ نومبر ۱۹۹۲ء کو نیشنل ہائی اسکول میں مشاعرہ ہوا تھا جس کی صدارت میں نے کی تھی۔ حیدرآباد سے اس مشاعرہ میں راشد آزر، گیان سنگھ شامڑ، منان منظور اور ذکی شادآب نے شرکت کی تھی۔



حیدرآباد کے بعض کل ہند مشاعروں کی نظامت کے علاوہ گولڈن جوبلی تقاریب نمائش سوسائٹی کے مشاعرہ کی معتمدی کے فرائض انجام دے چکا ہوں۔ صنعتی نمائش کے موقع پر ہر سال نمائش کلب میں مشاعرہ منعقد ہوتا ہے۔ گزشتہ ۱۷، ۱۸ سال سے مشاعرہ کی معتمدی کے فرائض انجام دے رہا ہوں۔ مجھ سے پہلے محترمہ عائشہ رشاد اور جناب شاہد صدیقی نظامت کیا کرتے تھے۔ نمائش سوسائٹی کی زیر نگرانی جناب ہاشم سعید کی مشاورت سے شعراء کی فہرست کو قطعیت دی جاتی ہے۔ نمائش سوسائٹی کے مشاعرے، شہر کے عام مشاعروں کے مقابلے میں اپنی انفرادیت رکھتے ہیں۔

میں نے آل انڈیا ریڈیو اور دور درشن کے - میٹر مشاعروں کی نظامت کے فرائض انجام دیئے ہیں۔ اس کے علاوہ کئی سرکاری مشاعروں کی معتمدی بھی کی ہے۔

(یہ سلسلہ اب بھی جاری ہے)

جن اساتذہ سخن نے مجھے متاثر کیا ان میں سے کچھ نام یہ ہیں۔
 میر تقی میر، مرزا غالب، یگانہ چنگیزی، علامہ اقبال، جگر مراد آبادی، جوش ملیح آبادی،
 خازن گورکھ پوری، فیض احمد فیض، مخدوم محی الدین، علی سردار جعفری، شاہد صدیقی،
 خورشید احمد جامی، یحیٰ زکھٹوی، جاں نثار اختر، اختر شیرانی۔ فارسی
 شعرا میں حافظ شیرازی اور امیر خسرو وغیرہ۔

اسکول کے اساتذہ میں جناب نبی الحسن، جناب علیم الدین اور کالج
 کے اساتذہ میں پروفیسر ابو ظفر عبدالواحد، پروفیسر سید محمد، ڈاکٹر حسینی شاہد،
 ڈاکٹر زینت ساجد، پروفیسر معنی تبسم اور منظور احمد منظور نے مجھے متاثر کیا ہے۔



میرے ہم عصر شاعروں میں دورِ حاضر کے وہ تمام شاعر شامل ہیں جو مشاعرے
 پڑھنے کے علاوہ ادبی رسائل میں پھبتے ہیں اور علمی و ادبی کام انجام دے چکے
 ہیں اور انجام دے رہے ہیں۔ حیدرآباد کے شاعروں میں خاص طور پر یہ نام
 قابل ذکر ہیں (جن کے ساتھ میں نے مشاعرے پڑھے ہیں)، علامہ حیرت بدایونی،
 علامہ نسیم آفندی، علامہ قدیر عریضی، مولانا شیخ احمد شکاری کمال، علامہ
 ناصر تبیدیری، تاج قریشی، شاہد صدیقی، مخدوم محی الدین، سکندر علی وجید،
 سلیمان اریب، منوہر لال شارب، نظر حبیب آبادی، حمیت علی شاعر، سلیمان
 خطیب، سرور ڈنڈا، شاذ تمکنت، ڈاکٹر وحید اختر، پروفیسر معنی تبسم، راشد آزر،
 عزیز قیس، سعید شہیدن، علی احمد ملی، خیرات ندیم، میر احمد خسرو، خواجہ شوق

انجم عارفی، حکیم قریشی، جهاندار افسر، روتھی قادری، افسر چغتائی، ریاست علی تاج، ذکی شاداب
 اوج یعقوبی، رئیس اختر، ناصر کرنولی، فیض الحسن خیرال، اٹکل حیدر آبادی، معطل علی
 رحمن جالٹی، ساجد رشوی، منظور احمد منظور، ڈاکٹر صادق نقوی، ڈاکٹر محمدین لال، ڈاکٹر محمد قمر الدین
 کنول پرشاد کنول، علی الدین نوید، منان منظور، عزیز بھارتی، بھان سنگھ شالہ
 مومن خاں شوق، جوہر ہاشمی، قدیر انصاری، ڈاکٹر منیر الزماں، منیر محمد حسین ملک، حمایت اللہ
 طالب ٹیڈی، ہندی شاعر، میں راجہ دوبے، اوم پرکاش نرمل، نیپال سنگھ ورما
 دولی چند ششی، کر جاشنکر گریس، نیندرامے، کالی چرن گپتا، راہی، ویر پرکاش
 لاہولی ساون، ڈاکٹر اندووش سٹ۔ اے بی وادھن وغیرہ۔

خاتون شہزاد میں عظمت عبدالقیوم، ڈاکٹر بانو طاہرہ سعید، خورشید نذیر
 روتھی علی اصغر، ناز حیدر، ڈاکٹر اشرف رفیع، سیدہ مجیدہ، نایاب سلطانی، فاطمہ تاج
 انجم قمر سوز، عزیز انصار صبا، مظفر النساء ناز، ثریا جہر، ڈاکٹر شمع پیرین، وغیرہ
 گذشتہ ۲۰ برسوں میں جتنے اہم شاعر، مشاعروں میں کلام سناتے رہے
 ہیں ان کے ساتھ مجھے مشاعرہ پڑھنے کا اعزاز حاصل رہا ہے (جن میں قابل ذکر کچھ نام
 یہ ہیں)۔

جوش ملیح آبادی، قراق گورکھپوری، آمنہ زائن ملّا، تلوک چند محروم،
 سجاد ظہیر، پروفیسر احتشام حسین، پروفیسر مسعود حسین خان، ڈاکٹر سید محمد الدین قادری
 زور، پروفیسر آل احمد سرور، فیض احمد فیض، مجروح سلطان پوری، شکیل بدایونی،
 مختار بارہ بسکوی، شمیم بٹے پوری، ساحر لہیا نوری، جال نثار اختر، کیفی اعظمی،
 مخدوم محمد الدین، شاہہ صدیقی، خورشید احمد جالٹی، حفیظ جالندھری، حمایت علی شاعر،
 علامہ نجم آفندی، مولانا شیخ محمد شطاری کامل، حضرت قادر علی، مرزا بشکوریگ،

بلاوجہ کسی ایک مصرعہ پر بھی اصلاح نہیں دیتے تھے۔ اگر مصرعہ صاف ہے تو اس کو بے محاسبہ رہنے دیتے اور اگر صاف نہ ہو تو کوئی ایک دو لفظ بدل دیتے۔ جب میں نے عسوس کیا کہ مجھ میں خود اعتمادی آگئی ہے تو میں نے ان دونوں استاذہ سخن کو اپنا کلام دکھانا ترک کر دیا۔



میرے شاگردوں میں ڈاکٹر منیر الزماں منیر، مظفر النساء تازہ، ڈاکٹر ختمح پریون، اقبال حسین اقبال اور کویت اکبر کے علاوہ اور بھی کچھ نئے اور پرانے شاعر ہیں جو وقتاً فوقتاً مجھ سے اپنے کلام پر اصلاح لیتے ہیں اپنی شاعری کے ابتدائی زمانے میں مجھ سے ثریا تہر اور شایعہاں عرشی نے بھی اپنے کلام پر اصلاح لی ہے۔



تخلیق شعریہ محرکات۔ ایک مثال

سکریٹریٹ اردو اسوسی ایشن جب اپنے پورے شباب پر تھی تو مجھے نئے نئے باصلاحیت لکھنے والوں اور فنکاروں کی تلاش تھی۔ اُس زمانے میں سکریٹریٹ اردو اسوسی ایشن کو آل انڈیا ریڈیو سے پروگرامس ملا کرتے تھے اسوسی ایشن کی جانب سے شعری، ادبی و تہذیبی پروگرامس کا اہتمام کیا جاتا تھا۔ ایک دن جب میں ریڈیائی پروگرام کی ترتیب و تیاری کے سلسلے میں رشید قریشی صاحب (نائب صدر اسوسی ایشن) اسسٹنٹ سکریٹری ہلت کے اجلاس پر پہنچا تو کچھ ہی دیر بعد شعبہ خواتین کی انچارج مظفر النساء ناز اپنی کچھ ساتھی لڑکیوں کے ساتھ وہاں آئیں۔ ریڈیو سے شہر ہوتے والے پروگرام کو قطعیت دینا تھا۔ اُن لڑکیوں میں ایک قبول صورت اور جاذب نظر لڑکی بھی تھی جو نئی نئی طرز ہو کر سکریٹریٹ آئی تھی، جس کو اچھا خاصا ادبی ذوق تھا۔ اس کے خد و خال پر کشش تھی۔ اس قدر پر کشش کہ دیکھنے والا مت شہر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ بے ساختہ یہ مصرع میری زبان سے نکلا۔

پھر بھی لگتا ہے کہ یہ مصرعوں کا شمار ہے

میں نے غزل اس طرح پوری کی —
پاک نظروں پہ بھی اندیشہ رسوائی ہے
جب سے دیکھا ہے تمہیں تہمت پہنائی ہے

اس سے پہلے کبھی میں نے تمہیں دیکھا تو نہیں
پھر بھی لگتا ہے کہ برسوں سے شناسائی ہے

۰۰

برگِ آوارہ کی مانند ہے تنہا تنہا
زندگی ساتھ مرا چھوڑ کے پکھتائی ہے

۰۰

وقتِ رخصت ذرا پلکوں کو بھکائے رکھتا
آنکھ مل جائے تو ہم دونوں کی رسوائی ہے



آٹوگراف اور شاعر

اردو شاعروں کی ایک روایت یہ بھی رہی ہے کہ ادب دوست خواتین و حضرات اور خاص طور پر طلباء و طالبات اپنے پسندیدہ شاعروں سے آٹوگراف لیا کرتے ہیں۔ آٹوگراف لینے والوں میں کچھ لوگ تو ایسے بھی ہوتے ہیں جو تفریحاً آٹوگراف لیتے ہیں اور بعض لوگ شاعرانہ شاعری سے متاثر ہو کر آٹوگراف لیتے ہیں۔ مجھے بھی بعض شاعروں کی طرح اپنی شاعرانہ زندگی میں آٹوگراف دینے کا

اتفاق ہوتا رہتا ہے۔ میں نے اکثر مشاعروں میں چاہے وہ شہر کے ہوں کہ اضلاع کے، چاہے بیرون شہر کے ہوں کہ بیرون ملک کے ہوں، آٹوگراف دیئے ہیں۔ خاص طور پر حیدرآباد میں (جامعہ عثمانیہ)، نظام کالج، طبیبہ کالج، دینکٹ راماریڈی وینس کالج، وینس کالج کوٹھی اور ہاودیالیہ کے مشاعروں میں بہت سے آٹوگراف دیئے ہیں۔ اس سلسلے میں صرف ایک کالج وینس ہاودیالیہ کا ذکر کرنا چاہوں گا۔

نمائش کلب میں شعبہ اردو وینس ہاودیالیہ کی جانب سے ۷ فروری ۱۹۶۳ء کو مشاعرہ ہوا تھا۔ اس وقت وینس ہاودیالیہ میں اردو کے پچھرا اختر حسن صاحب تھے، انہوں نے مجھے اپنے ایک خط کے ذریعہ نہ صرف شرکت کرنے اور کلام سنانے کی خواہش کی تھی بلکہ یہ چاہا تھا کہ میں اپنے بعض شاعر دوستوں کو اس مشاعرہ میں اپنے ہمراہ لے آؤں۔ اختر حسن صاحب نے لکھا تھا۔ ...

"میں لڑکیوں کے جس کالج میں پڑھاتا ہوں (وینس ہاودیالیہ) نمائش گراؤنڈ) اس کالج کے زیر اہتمام پیرسوں یعنی ۷ فروری ۱۹۶۳ء کو نمائش تھیٹر میں شام کے ۷ بجے سے ایک محفل مشاعرہ منعقد کی جا رہی ہے۔ یہ کام میرے ذمہ کیا گیا ہے کہ میں حیدرآباد کے قابل ذکر شعاعوں سے مل کر ان کو اس محفل میں شرکت کی دعوت دوں۔ اور آپ میں اپنی یہ ذمہ داری آپ کو سونپ رہا ہوں، اس یقین کے ساتھ کہ آپ نہ صرف خود تعاون فرمائیں گے بلکہ اپنے ساتھیوں کو بھی دعوت شرکت مشاعرہ پہنچا دیں گے بلکہ ان کو اپنے ساتھ لائیں گے۔ میں نمائش تھیٹر یا نمائش کلب میں آپ اسباب کا سواگت کرتے کیلئے موجود رہوں گا

میں چاہتا ہوں کہ آپ اپنے طور پر چند منتخب شاعروں کو میری جانب سے مدعو کر دیجئے۔ نوجوان شاعروں کو خاص طور پر دعوت دینا چاہتا ہوں۔ میں آپ سے خود ملنے کی بھی کوشش کروں گا، آجکات کو یا نکل۔ مدینہ ہوٹل میں مغرب کے بعد۔“
(۵/ فروری ۱۹۶۳ء)

جب مشاعرہ ختم ہوا تو لڑکیاں آٹو گراف کے لئے ہم شاعروں پر ٹوٹ پڑیں۔ خاص طور پر میں اور رئیس اختر کافی دیر تک آٹو گراف دیتے رہے، یہاں تک کہ ہمارے ساتھی ریفریشنٹ کے بعد واپس ہو رہے تھے۔ مشاعرہ کے بعد جب میں لڑکی رہا تھا تو نمائش کلب کے آفس اور مین گیٹ کے درمیان ایک درخت کے نیچے میں ۶۰۵ لڑکیاں کھڑی ہوئی تھیں، ان میں سے ایک دمازدہ، خوبصورت صحت مند لڑکی نے مجھے روک لیا اور میرے سامنے اپنی بیاض کھولی اور کہا کہ آٹو گراف دیجئے اور وہی شعر لکھیے جو میں لکھوانا چاہوں، میں نے کہا ٹھیک ہے۔ وہ غالباً بی۔ اے سال آخر کی طالبہ تھی، اخبارات، ریڈیو، رسائل اور شاعروں کی وساطت سے مجھ سے واقف تھی۔ وہ لڑکی میری غزل کے کچھ شعر اس طرح لکھواتی رہی۔

کہتے کہتے رکتے کیوں ہو، دل میں جو ہے کہہ دو۔ بھی
ہم بھی کوئی غصہ نہیں ہیں، آخر راتنا سو پڑوسی

جانا تو ہے سب کو لیکن آخر اتنی جلدی کیوں
کلب سے میں بیٹھا ہوں سر ہانے آنکھیں اپنی کو بوجھ

سب کو چھوڑ کے آیا ہوں میں تم کو کیا معلوم نہیں
جاؤ، کہاں محفل سے تمہاری آنکھیں اپنی کھول بھی۔

کس نثری کا باسی ہوں میں کس کی خاطر آیا ہوں
اُس دن اپنے پاس بلا کر مجھ سے رات نہ سوچو بھی

۰۰

اُن عطر آمیز، شگوار لمحوں کے بعد یہ لڑکی مجھے پھر نہیں دکھائی دی۔
لیکن مشاعروں میں جیسے بھی بھی لڑکیاں آٹو گراف لیتی ہیں تو مجھے وہ شام
مزاج، خوبصورت خود نوشتہ والی لڑکی بے ساختہ یاد آتی ہے۔



وینس کا لچ گلبرگہ کا مشاعرہ

آج سے ۱۹۶۸ سال پہلے کی بات ہے کہ حیدرآباد کے کچھ شعراء گلبرگہ کے
ایک بڑے مشاعرہ میں شرکت کے لئے گئے تھے۔ مشاعرہ کے دوسرے دن صبح ۱۱ بجے
جناب وہاب حندلیب کی قیادت میں ایک مشاعرہ، جہاں شعراء کی آمد کے سلسلے میں
شریمتی وی۔ جی۔ وینس، لچ میں منعقد ہوا۔ مشاعرہ گاہ میں خواتین و طالبات کی
کثیر تعداد موجود تھی۔ جیسے ہی وہاں شاعر دوستوں کے ساتھ شہ نشین پر پہونچا اور میں

اپنی نشست سنبھالی، بالکل میرے پیچھے میں ایک جاذب نظر، نہایت تیز و سنجیدہ لڑکی بیٹھی ہوئی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی اُس نے سلام کیا، اُس کے ہاتھ میں حیرانہ جھوٹے کلام "زخموں کے گلاب" تھا۔ اُس نے مجھ سے کہا کہ وہ حیدرآباد کی لڑکی ہے۔ اور حال ہی میں گھر کے میں بیاہی گئی ہے۔ اُسے شعرو شاعری سے بے حد لگاؤ ہے میری شاعری اُس کو بہت پسند ہے۔ اُس نے مجھ سے بھی کچھ کہہ کر وہ میرا کام اخبار سیاست میں پڑھتی رہتی ہے، ریڈیو اور مشاعروں کے وسیلے سے بھی مجھ سے اُس کا رشتہ ہے۔

اس واقعہ کو گذرے ہوئے کئی برس ہوئے، لیکن جب کبھی میں اپنے ماضی کے موراق الٹتا رہتا ہوں تو اُس لڑکی کو یاد پھر چھایاں بھی ان اوراق پر نظر آتی ہیں۔ پتہ نہیں کیوں میں آج تک بھی اُس لڑکی کے پاکیزہ صاف و شفاف چہرہ اور اس کے انداز گفتگو کو بھلا نہ سکا۔



مشاعروں میں بھگی پلکیں

۱۵، ۱۶ سال قبل انجمن قادریہ کی جانب سے جلوس خانہ لاڈ بازار میں عظیم الشان بیانے پر جلسہ رحمت العالمین کا اہتمام کیا گیا تھا۔ جلسے کی نگرانی سید مکرّم شاہ صدرین مجلس قانون ساز کونسل آندھرا پردیش نے کی تھی۔ مقررین میں ریاست کونالک کے

ایک وزیر عزیز سلیم بھی شامل تھے۔ میں بھی اُس جلسے میں ایک شاعر کی حیثیت سے مدعو تھا۔ میں نے ترنم میں ایک نعت شریف سُنا لی تھی، ایک شعر تقریباً ۶، ۵ بار پڑھوایا گیا۔ ساری محفل میں ایک نورانی فضا یہ چھا گئی۔ یوں محسوس ہو رہا تھا کہ سامعین ایک خاص کیفیت میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ شعر سُنا تے سُنا تے میں خود بھی گلوگر ہو گیا تھا۔ وہ شعر یہ ہے۔

آنکھوں میں لئے حسرتِ دیدارِ مدینہ

میں کب سے مدینہ کی طرف دیکھ رہا ہوں

نعت شریف کے کچھ اور شعر یہ ہیں۔

اللہ کرم کیجئے بہت ٹوٹ چکا ہوں

پھر آج میں حالات کی چوکھٹ پہ کھڑا ہوں

تغزوں کو جھکائے ہوئے آداب سے ملنے

میں آلِ پیغمبر کے گھرانے کا گدا ہوں

میں نقشِ قدم کس کے یہ پہچان لو مجھ کو

کچھ دن کے لئے میں بھی فیقروں میں رہا ہوں

آنکھوں میں تدامت ہے نظر اُٹھ نہیں سکتی

میں سر کو جھکا لئے ہوئے خاموش کھڑا ہوں

یہ اس نعت شریف کا ہی فیضان ہے کہ پروردگار نے مجھے روضہ اقدس پر حاضری

دینے کا موقع عنایت فرمایا



● ممتاز دانشور، محقق و نقاد ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور بعارضہ قلب کشمیر میں اچانک انتقال ہوا تو سارے ادبی حلقوں میں ایک ماتم کی سی کیفیت طاری ہو گئی تھی۔ سینکڑوں لوگ ایوان اردو میں جمع ہونے لگے۔ اُن سوگواروں میں ایک میں بھی تھا۔ موسم کی خرابی اور کشمیر میں مسلسل برف باری کی وجہ سے ڈاکٹر زور کی نعش کو حیدرآباد لانا ممکن نہ ہو سکا تھا۔ ڈاکٹر زور کے انتقال کے کچھ ہی دن بعد ایوان اردو میں بڑے پیمانے پر جلسہ تعزیت کا اہتمام کیا گیا تھا۔ تعزیتی نظم سناتے والے شاعروں میں، میں بھی شامل تھا۔ مجھے یاد ہے کہ جب میں نے اپنی نظم ترنم میں سنانی شروع کی تو محفل پر ایک اثر انگیز سوگوارانہ کیفیت چھا گئی۔ میں نے دیکھا کہ شعبہ خواتین میں کچھ خواتین رو رہی تھیں (رونے والوں میں ڈاکٹر زور کی بیگم اور ان کی لڑکیاں بھی تھیں) اس ماحول نے مجھ بھی رقت آمیز کیفیت میں مبتلا کر دیا۔ جب میں نے نظم کے یہ دو مصرعے سنائے تو محفل کی کیفیت ہی بدل گئی۔

کیا جہاں بھی نیند آجائے وہیں سوتے ہیں لوگ
زور! تیرے آخری دیدار کو روتے ہیں لوگ

ڈاکٹر زور کی شخصیت ہی ایسی تھی کہ محفل کا ہر شخص غموم دکھائی دے رہا تھا۔



● محمد علی آباد (انجمن باؤلی) میں میرے ایک دوست نواسہ حمید اللہ خاں کے نسبتی برادر غلام محی الدین کا اسکول تھا جس میں تمام اساتذہ خواتین تھیں۔ اسکول میں طالبہ کی کثیر تعداد تھی۔ شہر کے دوسرے اسکولوں کی طرح اس اسکول میں

بھی افتتاجیہ اور اختتامیہ جلسے بھی کرتے تھے۔ ایک افتتاجیہ جلسے میں
 متناثر عریفیض الحسن خیالی کو مدعو کیا گیا تھا۔ خیالی صاحب نے مجھ سے کہا کہ
 اس اسکول میں ایک خود پسند ٹیچر ہے جس نے میرے اشعار پر کچھ غصے تو جوہ نہیں دی۔
 میں چاہتا ہوں کہ اب کی بار اُس ٹیچر کو متاثر کیا جائے۔ میں نے کہا کہ دیکھا
 جائے گا۔ اسکول کی سالانہ تقریب میں خیالی اور میں مدعو تھے۔ اس محفل میں میں نے
 ایک غزل ترنم میں سنائی۔ میں نے دیکھا کہ اُس خود شناس لڑکی کی پلکیں بھیگ چکی
 ہیں۔ اُس غزل کے کچھ شعر یہ ہیں۔

پہا ہوتا ہوں کہ جی بھر کے باتیں کروں، عمر بھر آپ کا سات ہو یا نہ ہو
 کون جانے کہ کل بھر مرے ہاتھ میں آپ کا پھول سا ہات ہو یا نہ ہو

لے آگے ہے مگر ایک ہی سانس ہے تیری آواز میں میری آواز ہے
 پھر بھی ڈرتا ہوں اسے محمد آندو آغری سانس تک سا ہو یا نہ ہو

ایک ناموش غلام کے سوا کوئی عنوان نہیں آج کی رات کا
 آخری بار کرتا ہے عہدِ وفا پھر دھڑلہ ملاقات ہو یا نہ ہو

تیر غم زدہ سے بنام غزل، ایک مجروحِ فتنہ سمجھ کر سہی
 چوٹ کھایا ہوا گیت سن لیجئے، پھر یہ نغمات کی رات ہو یا نہ ہو





بلسلہ عرس شریف تقاریب مولانا کا مل شطاری، زیر اہتمام
 کامل اکیڈمی، ۲۰ جون ۱۹۹۰ء کی شب آستانہ شطاریہ (نورخاں بازار) میں ایک نمائندہ
 نعتیہ مشاعرہ منعقد ہوا تھا جس کی نگرانی مشہور انجمن الحاج محمد ولی قادری نے کی تھی۔ معتمد
 کے فرائض میں نے انجام دیئے تھے۔ عقیدت و احترام کے ماحول میں تمام شاعروں نے اپنا
 بہترین کام سنایا تھا۔ جب میں نے اس مطلع سے

وہ سرزمین پاک ابھی تک نظر میں ہے
 کیسا کرشمہ نسبت خیر البشر میں ہے

کے بعد یہ شعر سنایا۔

شرمندگی ہے سر کو جھکائے کھڑا ہوں میں
 عصیاں کا سب حساب مری چشم تریں ہے

تو ساری محفل پر ایک وجد اور کیفیت چھا گئی اور اس شعر کو زائد از آٹھ مرتبہ پڑھوایا
 گیا، جب میں مقطع کے اس شعر

نیتہ میں صبح و شام کی الجھن میں کیوں رہوں
 جب نظم دو جہاں مرے آقا کے گھر میں ہے

پر پہونچا تو میری بھی پلکیں بھیگ گئیں اور مجھے رقت آمیز کیفیت میں شعر سناتے سناتے
 کچھ دیر کیلئے رکتا پڑا اور میں اپنے آپ پر قابو پانے کے بعد مقطع مکمل کر سکا۔ میں نے دیکھا کہ بیشتر
 سامعین ایک خاص کیفیت اور محمدی میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ کبھی کبھی یہ رودگار اپنے گنہگار
 بندوں کو اس قدر نوازتا ہے کہ سوچنا پڑتا ہے کہ اسکو گنہگار کی کون سی ادا بھاگتی ہوگی۔ اللہ کی
 کرم نازیوں سے اتنا اطمینان تو ہو جاتا ہے کہ نعت رسول کے صدقے میں کچھ تو گناہ معاف ہو جائیگے۔

شاعر کو غائبانہ چاہنے والی ایک معصوم لڑکی

ایک معصوم سی، بھولی بھالی، سیدھی سادی لڑکی گذشتہ ۲، ۳ سال سے ہمیشہ تو نہیں، کبھی کبھی مجھ سے فون پر گفتگو کیا کرتی ہے۔ جب وہ بات کرتی ہے تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ اس کے لب و لہجہ میں ایک ایسی بیٹی کی خوشبو شامل ہے جس کی تربیت و پرورش، ایک علمی و ادبی گھرانے میں ہوئی ہے۔ وہ لڑکی میری شاعری کی بے حد مداح ہے۔ اُس کا کہنا ہے کہ اُس کے ہاں میرے تمام شعری نمونے ہیں۔ وہ لڑکی فون پر بہت دیر تک گفتگو کرتی ہے۔ گفتگو کا موضوع شعر و ادب ہوتا ہے۔ اُس لڑکی کو میں نے کبھی نہیں دیکھا لیکن اُس کی آواز اور اُس کے انداز گفتگو سے میں نے اس کی ایک خیالی تصویر بنالی ہے۔ یقیناً وہ میری بیٹی زینت اسیر کی طرح سیدھی ساوی، پیاری پیاری سی ہوگی۔ وہ لڑکی شاعر نہیں ہے، اُسے صرف اچھے اچھے شعر سُننے، پڑھنے اور یاد رکھنے کا شوق ہے۔ جب کبھی وہ مشاعروں میں یا ریڈیو اور ٹی وی سے میرا کام سنتی ہے تو مجھے فون ضرور کرتی ہے۔ پھر کچھ جینوں کے لئے غائب ہو جاتی ہے۔



حیدرآباد میں گنگا جمنی مشاعرے

حیدرآباد میں ہندی، اُردو کے ملے جلے مشاعرے اور ملی جلی ادبی محفلوں کی روایت کا سہرا حیدرآبادی تہذیب کی نمائندہ شخصیت جناب ایل۔ این۔ گیتا مرحوم (سابق سکریٹری پلاننگ ڈیپارٹمنٹ حکومت آندھرا پردیش کے سر جاتا ہے۔ مرحوم کے بعد اس روایت میں کمی ہونے لگی تھی، لیکن اس روایت کو زندہ رکھنے اور اس میں ایک نئی روح پھونکنے کے لئے، اُردو ہندی کے ممتاز شاعر جناب پیپھال سنگھ ورمانے دلچسپی لینی شروع کی اور میں نے اُردو شاعروں کی جانب سے اُن سے مکمل تعاون کیا۔ ہم دونوں نے اس روایت کو آگے بڑھانے کے لئے عملی اقدام شروع کیا، چنانچہ گزشتہ ۱۰، ۱۲ برس سے ہم اس بات کے لئے کوشاں ہیں کہ ہمارے دائرہ اختیار میں جہاں کہیں بھی مشاعرے اور کوی سمیلن منعقد ہوں یا ہم دونوں کی نگرانی یا مشاورت سے محفلیں سجا کرتی ہوں تو ہم لازماً ایسی راہ نکالیں کہ مشاعرے اور کوی سمیلن میں ہندی، اُردو کے شاعر شریک رہیں۔ چنانچہ ہم حوصلہ افزاء ماحول میں انتہائی کامیابی کے ساتھ اپنا کام انجام دے رہے ہیں۔ ان ملے جلے مشاعروں اور کوی سمیلن کی افادیت سے کون انکار کر سکتا ہے اس سے یہ ثبوت فراہم ہوتا ہے کہ حیدرآباد میں لسانی ہم آہنگی موجود ہے۔ اُردو اور ہندی کے دانشوروں، شاعروں اور ادیبوں میں یکجہتی ہے اور دونوں ایک دوسرے کی زبان کا احترام کرتے ہیں اور ان کے تحفظ اور چلن کے لئے اقدام کرتے ہیں۔

فرما صاحبِ گیت چاندنی اور ہندی لکھک سنگھ کی ادبی تقاریب اور کوی سملین میں لازمی طور پر اردو شاعروں اور ادیبوں کو مدعو کیا کرتے ہیں۔ مولانا ظفر احمد صاحب بھی اس غایت کا عملی ثبوت دینے کے لئے میرے زیر انتظام جتنے بھی مشاعرے ہوتے ہیں، ان میں ہندی کے کچھ نمائندہ شاعروں کو ضرور مدعو کرتا ہوں۔ یہ عمل آج بھی جاری ہے۔

۱۹۹۱ء

ہمارے شہر میں ماہِ فبروری میں جب اچانک منصوبہ بند طریقے سے بھانک فساد برپا ہوا تو اردو، ہندی کے شاعروں نے کئی ایک عمدہ نظمیں کہیں، مشاعروں آل انڈیا ریڈیو اور دور درشن کے مشاعروں میں نظمیں سننا کراچی کی جہتی کے فروغ کے لئے ایک اچھا تاثر چھوڑا۔

اردو ہندی کے ملے جلے مشاعروں کے انعقاد کے سلسلے میں جوائنٹ ایڈیٹر روزنامہ سیاست جناب محبوب حسین جگر ہمیشہ مجھ سے یہ کہتے رہتے ہیں کہ اردو مشاعروں

میں ہندی کے شاعروں کو ضرور مدعو کیا کرو۔ کیونکہ ہمارے شہر کی ایک خاص

اسلاف تہذیب ہے۔ یہاں کی تہذیبی روایات ملک کی تمام ریاستوں میں بالکل

علیحدہ نوعیت کی ہیں۔ جناب محبوب حسین جگر نے خود بھی عملی ثبوت دیتے ہوئے

مفتاحہ سیاست میں ہندی شاعروں کی بہت سی نظمیں شائع کیں (یہ سلسلہ

آج بھی جاری ہے)۔ سیاست کی طرح ہندی لاپسہ نیز بھی فسادات کے موضوع پر

اردو شاعروں کی ہندی اور اردو کی نظمیں شائع کیں۔ ہمارے شہر کے بعض مشاعروں

میں تلگو کے شاعروں کو بھی مدعو کیا جاتا ہے۔ جس کی مثال خاص طور پر مشاعرہ کن

اور سالار جنگ میوزیم کے سالانہ مشاعروں سے دی جا سکتی ہے۔ اردو کے مشاعروں

میں شرکت کرنے والے ہندی شاعر پنہپال سنگھ ورما کے علاوہ اوم پرکاش نرمل
 کنول پرشاد کنول، نریندر رائے، ویر پرکاش لاہوٹی ساون، وینو گوپال بھٹ،
 گرجا سنگھ گرجیش، کالی چرن گیتا راہی، ٹی۔ ایس۔ سنگھ لاٹ، دولی چند شیشی،
 سوادھین، ڈاکٹر اندو وشست، ڈاکٹر ایلا مشرا، پشپا دھما اور مینا گیتا، اور ہندی کوئی
 سمیلن میں شریک ہونے والے ہندو شاعروں میں سعید شہیدی، علی احمد جلیلی،
 امیر احمد خسرو، ڈاکٹر موہن لال نگم، صلاح الدین نیر، دانشہ آنور، رحمن جاتی،
 رئیس اختر، فیض الحسن خیال، ڈاکٹر صادق نقوی، منوہر لال بھلہ، عزیز بھارتی
 ڈاکٹر منیر الزماں نیر، موہن خاں شوق، متھن منظور، صادق امجد، علی الدین نوید،
 منظور احمد منظور، عیاض سنگھ خاٹک، بی کٹر بانو طاہرہ سنجہ، نایا کینہ سنگھ، مشعل
 عزیزہ المناصیا، ڈاکٹر شمع پروین اور کویتا کرن شامل ہیں۔



عظمت عبد القیوم

حیدر آبادی تہذیب کی نمائندہ خاتون عظمت عبد القیوم، میری منہ بولی بہنوں میں سب سے بڑی تھیں۔ وہ مسلم معاشرہ کی ایک جیتی جاگتی تصویر تھیں۔ ہر شخص کی زندگی میں بعض ایسی شخصیتیں بھی آتی ہیں جو نہایت خاموشی سے اپنے گہرے تاثرات چھوڑ جاتی ہیں۔ عظمت آپا کی شخصیت ایک عجیب نورانی کیفیات کی حامل تھی، ہمارے معاشرے کی کسی ہی قدر اور شخصیت کیوں نہ ہو، وہ اس پرکشش شخصیت سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتی تھی۔ اُن کی عزت و احترام کرنا جیسے ایک لازمی فریضہ تھا۔ ایسا احساس ہر اس شخص کا ہوتا تھا جو اُن سے ملنے کے لئے آتا تھا۔ اُن کے چہرہ پر اس قدر نور تھا کہ گمان ہوتا کہ یہہ ایک نورانی مخلوق ہیں۔ شخصیت کی جاذبیت اور پُر جمال چہرہ اُن کی طرف متوجہ کرتا تھا۔ لازم گفتاری، شائستہ روی، شگفتہ مزاجی، طبیعت کی سنجیدگی یہہ تمام خصوصیات ایک شخصیت میں ضم ہو گئی تھیں۔ عظمت آپا نے مجھے اپنے چھوٹے بھائی جیسا پیار دیا تھا، انہوں نے ہمیشہ مجھے محبت اور شفقت کی نظر سے دیکھا۔ وہ میری ہر بات سنجیدگی اور توجہ سے سنا کرتیں اور عمدگی اور نرمی سے جواب دیتیں۔ میں نے عظمت آپا کو کسی

کی بھی غیبت کرتے ہوئے کبھی نہیں سنا۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ ان کی زندگی کا سارا فلسفہ دوسروں کو خوش دیکھنا ہے۔ ایسے پاک صاف پُر نور پُر اثر، باوقار اور قابلِ احترام چہرے میں نے بہت کم دیکھے ہیں۔ سچ پوچھئے تو عظمت آپا حیدر آبادی تہذیب کی ایک روشن علامت تھیں جن پر جتنا فخر کیا جائے کم ہے۔

عظمت آپا کو میں نے ۲۸ سال پہلے ایوانِ اُردو کے ایک مشاعرہ میں دیکھا اور سنا تھا۔ وہ گوشِ خواتین میں بیٹھی ہوئی تھیں (ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورِ حیات تھے) مشاعرہ کا انتظام فرش پر تھا۔ ایوانِ اُردو شاہین مشاعرہ سے بھرا ہوا تھا۔ بعض ایسے شاعر جن سے اُن کے اچھے مراسم تھے اُن کے پاندان کے اطراف جمع ہو جاتے تھے، وہ اُن شاعروں کو بڑے خلوص سے پان بنانا کر پیش کرتی تھیں۔ اُن کے پاندان کے خانوں میں وہ تمام لوازمات ہمیشہ موجود رہتے تھے جو اچھے اور لذیذ پان کے لئے ضروری سمجھے جاتے ہیں۔ عظمت آپا کے کلام اور اُن کی باوقار شخصیت نے مجھے کافی متاثر کیا تھا۔ ایوانِ اُردو اور اُردو ہال کے مشاعروں میں اور کہیں کوئی خاص مشاعرہ ہو تو عظمت آپا اپنا کلام سناتی تھیں۔ مشاعروں میں رکھ رکھاؤ کا خاص خیال رکھتی تھیں۔ عظمت آپا سے ایسے خاص خاص مشاعروں میں صاحبِ سلامت رہتی تھی۔ اُس زمانے میں بعض ادب دوست گھرانوں میں شعر و سخن کی محفلیں سجا کرتی تھیں۔ ایسی محفلوں میں مجھے بھی مدعو کیا جاتا تھا۔

محفلِ خواتین کے قیام کے بعد مجھے عظمتِ آپا سے ملنے کا زیادہ موقع ملنے لگا۔ محفلِ خواتین کے ہر چھوٹے بڑے کام سے متعلق مجھ سے وہ لازماً مشورہ کیا کرتی تھیں۔ انہیں مجھ پر بھرپور اعتماد تھا کہ میں انہیں صحیح مشورہ دوں گا اور اُن سے مکمل تعاون کروں گا۔ عظمتِ آپا کے شوہر محترم عبدالقیوم صاحب چیف انجینئر مجھے بے حد چاہتے تھے۔ اُن کا مسکراتا ہوا پُر وقار چہرہ مجھے ہمیشہ متاثر کرتا رہا۔ اگر میں کسی خاص مشاعرہ میں شرکت کے لئے عظمتِ آپا سے خواہش کرتا تو قیوم صاحب یہ کہہ کر عظمتِ آپا کو مشاعرہ میں شرکت کی اجازت دیتے کہ نیشنل صاحب نے مدعو کیا ہے، تو یقیناً وہ محفلِ تمہارے لائق ہوگی، معیاری اور شائستہ بھی۔ تمہیں اس محفل میں شرکت کرنی چاہئے۔ (میری یہ فطرت ہے کہ مجھ پر جب کوئی بھروسہ کرتا ہے تو میں ہر قیمت اُس بھروسہ کی لاج رکھتا ہوں) اُن دنوں کے بزرگانہ اور مشفقانہ سلوک سے میں اُن کی جانب کھینچا جلا گیا۔ مشاعرے ہوں کہ محفلِ خواتین کے اجلاس، اُن کی سہیلی بیٹی شادان ہمیشہ اُن کے ساتھ رہتی تھی۔ شادان کو میرا ترنم بہت پسند ہے، وہ کہتی ہیں میرے بھائی جب آپ ترنم میں غزل سناتے ہیں تو مجھے رونا آتا ہے۔ بہت درد انگیز ترنم ہے آپ کا۔ عظمتِ آپا اپنی بیٹی شادان کو ستانے کے لئے کہتی تھیں کہ ہماری بیٹی کو تو ہمارا کلام پسند ہی نہیں، اُسے تو بس نیشنل بھائی کا کلام پسند ہے۔ (شادان میں وہ تمام خصوصیات مل جودیں جو چھوٹی بہنوں میں ہوتی ہیں)۔

محفلِ خواتین کی سرگرمیوں کو فروغ دینے میں عظمتِ آپا کا نام
 سرفہرست آتا ہے۔ اس تنظیم کی وقعت بہتر کارکردگی، انفرادیت اور
 وقار کو برقرار رکھنے کے لئے وہ بہت محنت کرتی تھیں۔ محفلِ خواتین کے
 استحکام کے لئے انہوں نے دماغ، درے، قلم، سنجے، قدمے ہر طرح کا
 تعاون کیا۔ عظمتِ آپا نے اپنی راست نگرانی میں محفلِ خواتین کی غزلوں کی
 رات، کاتین، مرتبہ اہتمام کیا تھا۔ وہ چار ادبی میگزین کی مدیر رہیں۔ اُن
 کے عملی تعاون سے محفلِ خواتین کا مالیہ مستحکم ہوا۔ انجمن کی سرگرمیوں
 اور سالانہ تقاریب کے انعقاد کے سلسلہ میں، میں نے انہیں کبھی تاؤ میدی
 اور مایوسی کا شکار ہوتے نہیں دیکھا۔ وہ بڑے عزم و استقلال کے ساتھ
 پُر اعتماد فضا میں کام کرتی تھیں۔ اور اپنے ساتھیوں سے بھی اُسی انداز
 سے کام لیتی تھیں۔ اُن کے کام کرنے کا انداز سب سے جداگانہ تھا۔
 دوستانہ ماحول میں کام کرنے کی انہیں عادت تھی۔ اُن کے ہر عمل سے اُن
 کا شخصی اور خاندانی وقار جھلکتا تھا۔ ہر کام میں معیار، سلیقہ، نفاست
 کا خیال رکھتی تھیں۔ دوا بط کے اس طویل عرصہ میں عظمتِ آپا کی نرم
 گفتاری میں کبھی فرق نہیں آیا۔ نہایت معاملہ فہم، متوازن مزاج،
 سنجیدہ طبیعت کی مالک تھیں۔ شائستگی، انسان دوستی اور شخصیتوں کا
 احترام و لحاظ ان کی طبیعت کا خاصہ تھا۔ عظمتِ آپا جہاں ایک اعلیٰ مرتبہ
 شاعرہ تھیں وہیں ایک صاحبِ طرز ادیب بھی تھیں۔ اُن کی سب سے بڑی
 دولت ان کی بیٹی شاداں ہے۔ عظمتِ آپا سے میری آخری ملاقات اُن کے

انتقال سے کچھ دن پہلے اُن کے مکان ”خیابان“ پر ہوئی۔ ۲۱ مئی ۱۹۶۸ء کی ابتدائی ساعتوں میں بہ عارضہ قلب ان کا انتقال ہو گیا۔ عظمت آپا کے انتقال کے بعد شہر کی بہت سی علمی، ادبی انجمنوں اور تہذیبی اداروں نے تعزیتی جلسے منعقد کئے۔ اور بعض ممتاز شخصیتوں، شاعروں اور ادیبوں نے بھی انفرادی طور پر اپنی تحریروں کے ذریعہ خراج عقیدت پیش کیا۔ یہ سلسلہ تقریباً ۱۰ ماہ تک جاری رہا۔ عظمت آپا کی یہہ دیرینہ خواہش تھی کہ مسلم اقلیت کی اعلیٰ تعلیم کے لئے اپنی بیٹی شاداں کے نام سے شاداں ایجوکیشنل سوسائٹی قائم کی جائے، جس کے زیر انتظام مسلم اقلیت کے لئے کالجس قائم کئے جائیں، چنانچہ ان کی زندگی میں شاداں کالج آف ایجوکیشن قائم کیا گیا، پھر جوئر کالج کی بنیاد رکھی گئی۔ اس کے بعد شاداں ڈگری کالج قائم کیا گیا۔ اب اس کالج میں کمپیوٹر سائنس کی تعلیم اور ایل ایل بی کی تعلیم کا بھی انتظام کیا گیا ہے۔ اس سوسائٹی کے لئے عظمت آپا نے اپنا زندگی بھر کا سرمایہ دیا ہے۔ ان کالجس کی وجہ سے بھی عظمت آپا کا نام ہمیشہ زندہ رہے گا۔ میری بہن شفیقہ قادری پکھار شاداں کالج نے عظمت آپا کی رہائش گاہ ”خیابان“ کی مناسبت سے ”ہزم خیابان“ قائم کیا تھا۔ اس ہزم خیابان کا شاندار افتتاح عظمت آپا کی زندگی میں ہوا جس کے لئے شفیقہ نے کافی محنت کی تھی۔ عظمت آپا کا سلوک ہمیشہ مجھ سے، ایک چھوٹے بھائی جیسا رہا، انہیں مجھ سے بے حد خلوص تھا۔ ہینہ میں ۳، ۴، ۵، ۶، ۷، ۸، ۹، ۱۰، ۱۱، ۱۲، ۱۳، ۱۴، ۱۵، ۱۶، ۱۷، ۱۸، ۱۹، ۲۰، ۲۱، ۲۲، ۲۳، ۲۴، ۲۵، ۲۶، ۲۷، ۲۸، ۲۹، ۳۰، ۳۱، ۳۲، ۳۳، ۳۴، ۳۵، ۳۶، ۳۷، ۳۸، ۳۹، ۴۰، ۴۱، ۴۲، ۴۳، ۴۴، ۴۵، ۴۶، ۴۷، ۴۸، ۴۹، ۵۰، ۵۱، ۵۲، ۵۳، ۵۴، ۵۵، ۵۶، ۵۷، ۵۸، ۵۹، ۶۰، ۶۱، ۶۲، ۶۳، ۶۴، ۶۵، ۶۶، ۶۷، ۶۸، ۶۹، ۷۰، ۷۱، ۷۲، ۷۳، ۷۴، ۷۵، ۷۶، ۷۷، ۷۸، ۷۹، ۸۰، ۸۱، ۸۲، ۸۳، ۸۴، ۸۵، ۸۶، ۸۷، ۸۸، ۸۹، ۹۰، ۹۱، ۹۲، ۹۳، ۹۴، ۹۵، ۹۶، ۹۷، ۹۸، ۹۹، ۱۰۰، ۱۰۱، ۱۰۲، ۱۰۳، ۱۰۴، ۱۰۵، ۱۰۶، ۱۰۷، ۱۰۸، ۱۰۹، ۱۱۰، ۱۱۱، ۱۱۲، ۱۱۳، ۱۱۴، ۱۱۵، ۱۱۶، ۱۱۷، ۱۱۸، ۱۱۹، ۱۲۰، ۱۲۱، ۱۲۲، ۱۲۳، ۱۲۴، ۱۲۵، ۱۲۶، ۱۲۷، ۱۲۸، ۱۲۹، ۱۳۰، ۱۳۱، ۱۳۲، ۱۳۳، ۱۳۴، ۱۳۵، ۱۳۶، ۱۳۷، ۱۳۸، ۱۳۹، ۱۴۰، ۱۴۱، ۱۴۲، ۱۴۳، ۱۴۴، ۱۴۵، ۱۴۶، ۱۴۷، ۱۴۸، ۱۴۹، ۱۵۰، ۱۵۱، ۱۵۲، ۱۵۳، ۱۵۴، ۱۵۵، ۱۵۶، ۱۵۷، ۱۵۸، ۱۵۹، ۱۶۰، ۱۶۱، ۱۶۲، ۱۶۳، ۱۶۴، ۱۶۵، ۱۶۶، ۱۶۷، ۱۶۸، ۱۶۹، ۱۷۰، ۱۷۱، ۱۷۲، ۱۷۳، ۱۷۴، ۱۷۵، ۱۷۶، ۱۷۷، ۱۷۸، ۱۷۹، ۱۸۰، ۱۸۱، ۱۸۲، ۱۸۳، ۱۸۴، ۱۸۵، ۱۸۶، ۱۸۷، ۱۸۸، ۱۸۹، ۱۹۰، ۱۹۱، ۱۹۲، ۱۹۳، ۱۹۴، ۱۹۵، ۱۹۶، ۱۹۷، ۱۹۸، ۱۹۹، ۲۰۰، ۲۰۱، ۲۰۲، ۲۰۳، ۲۰۴، ۲۰۵، ۲۰۶، ۲۰۷، ۲۰۸، ۲۰۹، ۲۱۰، ۲۱۱، ۲۱۲، ۲۱۳، ۲۱۴، ۲۱۵، ۲۱۶، ۲۱۷، ۲۱۸، ۲۱۹، ۲۲۰، ۲۲۱، ۲۲۲، ۲۲۳، ۲۲۴، ۲۲۵، ۲۲۶، ۲۲۷، ۲۲۸، ۲۲۹، ۲۳۰، ۲۳۱، ۲۳۲، ۲۳۳، ۲۳۴، ۲۳۵، ۲۳۶، ۲۳۷، ۲۳۸، ۲۳۹، ۲۴۰، ۲۴۱، ۲۴۲، ۲۴۳، ۲۴۴، ۲۴۵، ۲۴۶، ۲۴۷، ۲۴۸، ۲۴۹، ۲۵۰، ۲۵۱، ۲۵۲، ۲۵۳، ۲۵۴، ۲۵۵، ۲۵۶، ۲۵۷، ۲۵۸، ۲۵۹، ۲۶۰، ۲۶۱، ۲۶۲، ۲۶۳، ۲۶۴، ۲۶۵، ۲۶۶، ۲۶۷، ۲۶۸، ۲۶۹، ۲۷۰، ۲۷۱، ۲۷۲، ۲۷۳، ۲۷۴، ۲۷۵، ۲۷۶، ۲۷۷، ۲۷۸، ۲۷۹، ۲۸۰، ۲۸۱، ۲۸۲، ۲۸۳، ۲۸۴، ۲۸۵، ۲۸۶، ۲۸۷، ۲۸۸، ۲۸۹، ۲۹۰، ۲۹۱، ۲۹۲، ۲۹۳، ۲۹۴، ۲۹۵، ۲۹۶، ۲۹۷، ۲۹۸، ۲۹۹، ۳۰۰، ۳۰۱، ۳۰۲، ۳۰۳، ۳۰۴، ۳۰۵، ۳۰۶، ۳۰۷، ۳۰۸، ۳۰۹، ۳۱۰، ۳۱۱، ۳۱۲، ۳۱۳، ۳۱۴، ۳۱۵، ۳۱۶، ۳۱۷، ۳۱۸، ۳۱۹، ۳۲۰، ۳۲۱، ۳۲۲، ۳۲۳، ۳۲۴، ۳۲۵، ۳۲۶، ۳۲۷، ۳۲۸، ۳۲۹، ۳۳۰، ۳۳۱، ۳۳۲، ۳۳۳، ۳۳۴، ۳۳۵، ۳۳۶، ۳۳۷، ۳۳۸، ۳۳۹، ۳۴۰، ۳۴۱، ۳۴۲، ۳۴۳، ۳۴۴، ۳۴۵، ۳۴۶، ۳۴۷، ۳۴۸، ۳۴۹، ۳۵۰، ۳۵۱، ۳۵۲، ۳۵۳، ۳۵۴، ۳۵۵، ۳۵۶، ۳۵۷، ۳۵۸، ۳۵۹، ۳۶۰، ۳۶۱، ۳۶۲، ۳۶۳، ۳۶۴، ۳۶۵، ۳۶۶، ۳۶۷، ۳۶۸، ۳۶۹، ۳۷۰، ۳۷۱، ۳۷۲، ۳۷۳، ۳۷۴، ۳۷۵، ۳۷۶، ۳۷۷، ۳۷۸، ۳۷۹، ۳۸۰، ۳۸۱، ۳۸۲، ۳۸۳، ۳۸۴، ۳۸۵، ۳۸۶، ۳۸۷، ۳۸۸، ۳۸۹، ۳۹۰، ۳۹۱، ۳۹۲، ۳۹۳، ۳۹۴، ۳۹۵، ۳۹۶، ۳۹۷، ۳۹۸، ۳۹۹، ۴۰۰، ۴۰۱، ۴۰۲، ۴۰۳، ۴۰۴، ۴۰۵، ۴۰۶، ۴۰۷، ۴۰۸، ۴۰۹، ۴۱۰، ۴۱۱، ۴۱۲، ۴۱۳، ۴۱۴، ۴۱۵، ۴۱۶، ۴۱۷، ۴۱۸، ۴۱۹، ۴۲۰، ۴۲۱، ۴۲۲، ۴۲۳، ۴۲۴، ۴۲۵، ۴۲۶، ۴۲۷، ۴۲۸، ۴۲۹، ۴۳۰، ۴۳۱، ۴۳۲، ۴۳۳، ۴۳۴، ۴۳۵، ۴۳۶، ۴۳۷، ۴۳۸، ۴۳۹، ۴۴۰، ۴۴۱، ۴۴۲، ۴۴۳، ۴۴۴، ۴۴۵، ۴۴۶، ۴۴۷، ۴۴۸، ۴۴۹، ۴۵۰، ۴۵۱، ۴۵۲، ۴۵۳، ۴۵۴، ۴۵۵، ۴۵۶، ۴۵۷، ۴۵۸، ۴۵۹، ۴۶۰، ۴۶۱، ۴۶۲، ۴۶۳، ۴۶۴، ۴۶۵، ۴۶۶، ۴۶۷، ۴۶۸، ۴۶۹، ۴۷۰، ۴۷۱، ۴۷۲، ۴۷۳، ۴۷۴، ۴۷۵، ۴۷۶، ۴۷۷، ۴۷۸، ۴۷۹، ۴۸۰، ۴۸۱، ۴۸۲، ۴۸۳، ۴۸۴، ۴۸۵، ۴۸۶، ۴۸۷، ۴۸۸، ۴۸۹، ۴۹۰، ۴۹۱، ۴۹۲، ۴۹۳، ۴۹۴، ۴۹۵، ۴۹۶، ۴۹۷، ۴۹۸، ۴۹۹، ۵۰۰، ۵۰۱، ۵۰۲، ۵۰۳، ۵۰۴، ۵۰۵، ۵۰۶، ۵۰۷، ۵۰۸، ۵۰۹، ۵۱۰، ۵۱۱، ۵۱۲، ۵۱۳، ۵۱۴، ۵۱۵، ۵۱۶، ۵۱۷، ۵۱۸، ۵۱۹، ۵۲۰، ۵۲۱، ۵۲۲، ۵۲۳، ۵۲۴، ۵۲۵، ۵۲۶، ۵۲۷، ۵۲۸، ۵۲۹، ۵۳۰، ۵۳۱، ۵۳۲، ۵۳۳، ۵۳۴، ۵۳۵، ۵۳۶، ۵۳۷، ۵۳۸، ۵۳۹، ۵۴۰، ۵۴۱، ۵۴۲، ۵۴۳، ۵۴۴، ۵۴۵، ۵۴۶، ۵۴۷، ۵۴۸، ۵۴۹، ۵۵۰، ۵۵۱، ۵۵۲، ۵۵۳، ۵۵۴، ۵۵۵، ۵۵۶، ۵۵۷، ۵۵۸، ۵۵۹، ۵۶۰، ۵۶۱، ۵۶۲، ۵۶۳، ۵۶۴، ۵۶۵، ۵۶۶، ۵۶۷، ۵۶۸، ۵۶۹، ۵۷۰، ۵۷۱، ۵۷۲، ۵۷۳، ۵۷۴، ۵۷۵، ۵۷۶، ۵۷۷، ۵۷۸، ۵۷۹، ۵۸۰، ۵۸۱، ۵۸۲، ۵۸۳، ۵۸۴، ۵۸۵، ۵۸۶، ۵۸۷، ۵۸۸، ۵۸۹، ۵۹۰، ۵۹۱، ۵۹۲، ۵۹۳، ۵۹۴، ۵۹۵، ۵۹۶، ۵۹۷، ۵۹۸، ۵۹۹، ۶۰۰، ۶۰۱، ۶۰۲، ۶۰۳، ۶۰۴، ۶۰۵، ۶۰۶، ۶۰۷، ۶۰۸، ۶۰۹، ۶۱۰، ۶۱۱، ۶۱۲، ۶۱۳، ۶۱۴، ۶۱۵، ۶۱۶، ۶۱۷، ۶۱۸، ۶۱۹، ۶۲۰، ۶۲۱، ۶۲۲، ۶۲۳، ۶۲۴، ۶۲۵، ۶۲۶، ۶۲۷، ۶۲۸، ۶۲۹، ۶۳۰، ۶۳۱، ۶۳۲، ۶۳۳، ۶۳۴، ۶۳۵، ۶۳۶، ۶۳۷، ۶۳۸، ۶۳۹، ۶۴۰، ۶۴۱، ۶۴۲، ۶۴۳، ۶۴۴، ۶۴۵، ۶۴۶، ۶۴۷، ۶۴۸، ۶۴۹، ۶۵۰، ۶۵۱، ۶۵۲، ۶۵۳، ۶۵۴، ۶۵۵، ۶۵۶، ۶۵۷، ۶۵۸، ۶۵۹، ۶۶۰، ۶۶۱، ۶۶۲، ۶۶۳، ۶۶۴، ۶۶۵، ۶۶۶، ۶۶۷، ۶۶۸، ۶۶۹، ۶۷۰، ۶۷۱، ۶۷۲، ۶۷۳، ۶۷۴، ۶۷۵، ۶۷۶، ۶۷۷، ۶۷۸، ۶۷۹، ۶۸۰، ۶۸۱، ۶۸۲، ۶۸۳، ۶۸۴، ۶۸۵، ۶۸۶، ۶۸۷، ۶۸۸، ۶۸۹، ۶۹۰، ۶۹۱، ۶۹۲، ۶۹۳، ۶۹۴، ۶۹۵، ۶۹۶، ۶۹۷، ۶۹۸، ۶۹۹، ۷۰۰، ۷۰۱، ۷۰۲، ۷۰۳، ۷۰۴، ۷۰۵، ۷۰۶، ۷۰۷، ۷۰۸، ۷۰۹، ۷۱۰، ۷۱۱، ۷۱۲، ۷۱۳، ۷۱۴، ۷۱۵، ۷۱۶، ۷۱۷، ۷۱۸، ۷۱۹، ۷۲۰، ۷۲۱، ۷۲۲، ۷۲۳، ۷۲۴، ۷۲۵، ۷۲۶، ۷۲۷، ۷۲۸، ۷۲۹، ۷۳۰، ۷۳۱، ۷۳۲، ۷۳۳، ۷۳۴، ۷۳۵، ۷۳۶، ۷۳۷، ۷۳۸، ۷۳۹، ۷۴۰، ۷۴۱، ۷۴۲، ۷۴۳، ۷۴۴، ۷۴۵، ۷۴۶، ۷۴۷، ۷۴۸، ۷۴۹، ۷۵۰، ۷۵۱، ۷۵۲، ۷۵۳، ۷۵۴، ۷۵۵، ۷۵۶، ۷۵۷، ۷۵۸، ۷۵۹، ۷۶۰، ۷۶۱، ۷۶۲، ۷۶۳، ۷۶۴، ۷۶۵، ۷۶۶، ۷۶۷، ۷۶۸، ۷۶۹، ۷۷۰، ۷۷۱، ۷۷۲، ۷۷۳، ۷۷۴، ۷۷۵، ۷۷۶، ۷۷۷، ۷۷۸، ۷۷۹، ۷۸۰، ۷۸۱، ۷۸۲، ۷۸۳، ۷۸۴، ۷۸۵، ۷۸۶، ۷۸۷، ۷۸۸، ۷۸۹، ۷۹۰، ۷۹۱، ۷۹۲، ۷۹۳، ۷۹۴، ۷۹۵، ۷۹۶، ۷۹۷، ۷۹۸، ۷۹۹، ۸۰۰، ۸۰۱، ۸۰۲، ۸۰۳، ۸۰۴، ۸۰۵، ۸۰۶، ۸۰۷، ۸۰۸، ۸۰۹، ۸۱۰، ۸۱۱، ۸۱۲، ۸۱۳، ۸۱۴، ۸۱۵، ۸۱۶، ۸۱۷، ۸۱۸، ۸۱۹، ۸۲۰، ۸۲۱، ۸۲۲، ۸۲۳، ۸۲۴، ۸۲۵، ۸۲۶، ۸۲۷، ۸۲۸، ۸۲۹، ۸۳۰، ۸۳۱، ۸۳۲، ۸۳۳، ۸۳۴، ۸۳۵، ۸۳۶، ۸۳۷، ۸۳۸، ۸۳۹، ۸۴۰، ۸۴۱، ۸۴۲، ۸۴۳، ۸۴۴، ۸۴۵، ۸۴۶، ۸۴۷، ۸۴۸، ۸۴۹، ۸۵۰، ۸۵۱، ۸۵۲، ۸۵۳، ۸۵۴، ۸۵۵، ۸۵۶، ۸۵۷، ۸۵۸، ۸۵۹، ۸۶۰، ۸۶۱، ۸۶۲، ۸۶۳، ۸۶۴، ۸۶۵، ۸۶۶، ۸۶۷، ۸۶۸، ۸۶۹، ۸۷۰، ۸۷۱، ۸۷۲، ۸۷۳، ۸۷۴، ۸۷۵، ۸۷۶، ۸۷۷، ۸۷۸، ۸۷۹، ۸۸۰، ۸۸۱، ۸۸۲، ۸۸۳، ۸۸۴، ۸۸۵، ۸۸۶، ۸۸۷، ۸۸۸، ۸۸۹، ۸۹۰، ۸۹۱، ۸۹۲، ۸۹۳، ۸۹۴، ۸۹۵، ۸۹۶، ۸۹۷، ۸۹۸، ۸۹۹، ۹۰۰، ۹۰۱، ۹۰۲، ۹۰۳، ۹۰۴، ۹۰۵، ۹۰۶، ۹۰۷، ۹۰۸، ۹۰۹، ۹۱۰، ۹۱۱، ۹۱۲، ۹۱۳، ۹۱۴، ۹۱۵، ۹۱۶، ۹۱۷، ۹۱۸، ۹۱۹، ۹۲۰، ۹۲۱، ۹۲۲، ۹۲۳، ۹۲۴، ۹۲۵، ۹۲۶، ۹۲۷، ۹۲۸، ۹۲۹، ۹۳۰، ۹۳۱، ۹۳۲، ۹۳۳، ۹۳۴، ۹۳۵، ۹۳۶، ۹۳۷، ۹۳۸، ۹۳۹، ۹۴۰، ۹۴۱، ۹۴۲، ۹۴۳، ۹۴۴، ۹۴۵، ۹۴۶، ۹۴۷، ۹۴۸، ۹۴۹، ۹۵۰، ۹۵۱، ۹۵۲، ۹۵۳، ۹۵۴، ۹۵۵، ۹۵۶، ۹۵۷، ۹۵۸، ۹۵۹، ۹۶۰، ۹۶۱، ۹۶۲، ۹۶۳، ۹۶۴، ۹۶۵، ۹۶۶، ۹۶۷، ۹۶۸، ۹۶۹، ۹۷۰، ۹۷۱، ۹۷۲، ۹۷۳، ۹۷۴، ۹۷۵، ۹۷۶، ۹۷۷، ۹۷۸، ۹۷۹، ۹۸۰، ۹۸۱، ۹۸۲، ۹۸۳، ۹۸۴، ۹۸۵، ۹۸۶، ۹۸۷، ۹۸۸، ۹۸۹، ۹۹۰، ۹۹۱، ۹۹۲، ۹۹۳، ۹۹۴، ۹۹۵، ۹۹۶، ۹۹۷، ۹۹۸، ۹۹۹، ۱۰۰۰، ۱۰۰۱، ۱۰۰۲، ۱۰۰۳، ۱۰۰۴، ۱۰۰۵، ۱۰۰۶، ۱۰۰۷، ۱۰۰۸، ۱۰۰۹، ۱۰۱۰، ۱۰۱۱، ۱۰۱۲، ۱۰۱۳، ۱۰۱۴، ۱۰۱۵، ۱۰۱۶، ۱۰۱۷، ۱۰۱۸، ۱۰۱۹، ۱۰۲۰، ۱۰۲۱، ۱۰۲۲، ۱۰۲۳، ۱۰۲۴، ۱۰۲۵، ۱۰۲۶، ۱۰۲۷، ۱۰۲۸، ۱۰۲۹، ۱۰۳۰، ۱۰۳۱، ۱۰۳۲، ۱۰۳۳، ۱۰۳۴، ۱۰۳۵، ۱۰۳۶، ۱۰۳۷، ۱۰۳۸، ۱۰۳۹، ۱۰۴۰، ۱۰۴۱، ۱۰۴۲، ۱۰۴۳، ۱۰۴۴، ۱۰۴۵، ۱۰۴۶، ۱۰۴۷، ۱۰۴۸، ۱۰۴۹، ۱۰۵۰، ۱۰۵۱، ۱۰۵۲، ۱۰۵۳، ۱۰۵۴، ۱۰۵۵، ۱۰۵۶، ۱۰۵۷، ۱۰۵۸، ۱۰۵۹، ۱۰۶۰، ۱۰۶۱، ۱۰۶۲، ۱۰۶۳، ۱۰۶۴، ۱۰۶۵، ۱۰۶۶، ۱۰۶۷، ۱۰۶۸، ۱۰۶۹، ۱۰۷۰، ۱۰۷۱، ۱۰۷۲، ۱۰۷۳، ۱۰۷۴، ۱۰۷۵، ۱۰۷۶، ۱۰۷۷، ۱۰۷۸، ۱۰۷۹، ۱۰۸۰، ۱۰۸۱، ۱۰۸۲، ۱۰۸۳، ۱۰۸۴، ۱۰۸۵، ۱۰۸۶، ۱۰۸۷، ۱۰۸۸، ۱۰۸۹، ۱۰۹۰، ۱۰۹۱، ۱۰۹۲، ۱۰۹۳، ۱۰۹۴، ۱۰۹۵، ۱۰۹۶، ۱۰۹۷، ۱۰۹۸، ۱۰۹۹، ۱۱۰۰، ۱۱۰۱، ۱۱۰۲، ۱۱۰۳، ۱۱۰۴، ۱۱۰۵، ۱۱۰۶، ۱۱۰۷، ۱۱۰۸، ۱۱۰۹، ۱۱۱۰، ۱۱۱۱، ۱۱۱۲، ۱۱۱۳، ۱۱۱۴، ۱۱۱۵، ۱۱۱۶، ۱۱۱۷، ۱۱۱۸، ۱۱۱۹، ۱۱۲۰، ۱۱۲۱، ۱۱۲۲، ۱۱۲۳، ۱۱۲۴، ۱۱۲۵، ۱۱۲۶، ۱۱۲۷، ۱۱۲۸، ۱۱۲۹، ۱۱۳۰، ۱۱۳۱، ۱۱۳۲، ۱۱۳۳، ۱۱۳۴، ۱۱۳۵، ۱۱۳۶، ۱۱۳۷، ۱۱۳۸، ۱۱۳۹، ۱۱۴۰، ۱۱۴۱، ۱۱۴۲، ۱۱۴۳، ۱۱۴۴، ۱۱۴۵، ۱۱۴۶، ۱۱۴۷، ۱۱۴۸، ۱۱۴۹، ۱۱۵۰، ۱۱۵۱، ۱۱۵۲، ۱۱۵۳، ۱۱۵۴، ۱۱۵۵، ۱۱۵۶، ۱۱۵۷، ۱۱۵۸، ۱۱۵۹، ۱۱۶۰، ۱۱۶۱، ۱۱۶۲، ۱۱۶۳، ۱۱۶۴، ۱۱۶۵، ۱۱۶۶، ۱۱۶۷، ۱۱۶۸، ۱۱۶۹، ۱۱۷۰، ۱۱۷۱، ۱۱۷۲، ۱۱۷۳، ۱۱۷۴، ۱۱۷۵، ۱۱۷۶، ۱۱۷۷، ۱۱۷۸، ۱۱۷۹، ۱۱۸۰، ۱۱۸۱، ۱۱۸۲، ۱۱۸۳، ۱۱۸۴، ۱۱۸۵، ۱۱۸۶، ۱۱۸۷، ۱۱۸۸، ۱۱۸۹، ۱۱۹۰، ۱۱۹۱، ۱۱۹۲، ۱۱۹۳، ۱۱۹۴، ۱۱۹۵، ۱۱۹۶، ۱۱۹۷، ۱۱۹۸، ۱۱۹۹، ۱۲۰۰، ۱۲۰۱، ۱۲۰۲، ۱۲۰۳، ۱۲۰۴، ۱۲۰۵، ۱۲۰۶، ۱۲۰۷، ۱۲۰۸، ۱۲۰۹، ۱۲۱۰، ۱۲۱۱، ۱۲۱۲، ۱۲۱۳، ۱۲۱۴، ۱۲۱۵، ۱۲۱۶، ۱۲۱۷، ۱۲۱۸، ۱۲۱۹، ۱۲۲۰، ۱۲۲۱، ۱۲۲۲، ۱۲۲۳، ۱۲۲۴، ۱۲۲۵، ۱۲۲۶، ۱۲۲۷، ۱۲۲۸، ۱۲۲۹، ۱۲۳۰، ۱۲۳۱، ۱۲۳۲، ۱۲۳۳، ۱۲۳۴، ۱۲۳۵، ۱۲۳۶، ۱۲۳۷، ۱۲۳۸، ۱۲۳۹، ۱۲۴۰، ۱۲۴۱، ۱۲۴۲، ۱۲۴۳، ۱۲۴۴، ۱۲۴۵، ۱۲۴۶، ۱۲۴۷، ۱۲۴۸، ۱۲۴۹، ۱۲۵۰، ۱۲۵۱، ۱۲۵۲، ۱۲۵۳، ۱۲۵۴، ۱۲۵۵، ۱۲۵۶، ۱۲۵۷، ۱۲۵۸، ۱۲۵۹، ۱۲۶۰، ۱۲۶۱، ۱۲۶۲، ۱۲۶۳، ۱۲۶۴، ۱۲۶۵، ۱۲۶۶، ۱۲۶۷، ۱۲۶۸، ۱۲۶۹، ۱۲۷۰، ۱۲۷۱، ۱۲۷۲، ۱۲۷۳، ۱۲۷۴، ۱۲۷۵، ۱۲۷۶، ۱۲۷۷، ۱۲۷۸، ۱۲۷۹، ۱۲۸۰، ۱۲۸۱، ۱۲۸۲، ۱۲۸۳، ۱۲۸۴، ۱۲۸۵، ۱۲۸۶، ۱۲۸۷، ۱۲۸۸، ۱۲۸۹، ۱۲۹۰، ۱۲۹۱، ۱۲۹۲، ۱۲۹۳، ۱۲۹۴، ۱۲۹۵، ۱۲۹۶، ۱۲۹۷، ۱۲۹۸، ۱۲۹۹، ۱۳۰۰، ۱۳۰۱، ۱۳۰۲، ۱۳۰۳، ۱۳۰۴، ۱۳۰۵، ۱۳۰۶، ۱۳۰۷، ۱۳۰۸، ۱۳۰۹، ۱۳۱۰، ۱۳۱۱، ۱۳۱۲، ۱۳۱۳، ۱۳۱۴، ۱۳۱۵، ۱۳۱۶، ۱۳۱۷، ۱۳۱۸، ۱۳۱۹، ۱۳۲۰، ۱۳۲۱، ۱۳۲۲، ۱۳۲۳، ۱۳۲۴، ۱۳۲۵، ۱۳۲۶، ۱۳۲۷، ۱۳۲۸، ۱۳۲۹، ۱۳۳۰، ۱۳۳۱، ۱۳۳۲، ۱۳۳۳، ۱۳۳۴، ۱۳۳۵، ۱۳۳۶، ۱۳۳۷، ۱۳۳۸، ۱۳۳۹، ۱۳۴۰، ۱۳۴۱، ۱۳۴۲، ۱۳۴۳، ۱۳۴۴، ۱۳۴۵، ۱۳۴۶، ۱۳۴۷، ۱۳۴۸، ۱۳۴۹، ۱۳۵۰، ۱۳۵۱، ۱۳۵۲، ۱۳۵۳، ۱۳۵۴، ۱۳۵۵، ۱۳۵۶، ۱۳۵۷، ۱۳۵۸، ۱۳۵۹، ۱۳۶۰، ۱۳۶۱، ۱۳۶۲، ۱۳۶۳، ۱۳۶۴، ۱۳۶۵، ۱۳۶۶، ۱۳۶۷، ۱۳۶۸، ۱۳۶۹، ۱۳۷۰، ۱۳۷۱، ۱۳۷۲، ۱۳۷۳، ۱۳۷۴، ۱۳۷۵، ۱۳۷۶، ۱۳۷۷، ۱۳۷۸، ۱۳۷۹، ۱۳۸۰، ۱۳۸۱، ۱۳۸۲، ۱۳۸۳، ۱۳۸۴، ۱۳۸۵، ۱۳۸۶، ۱۳۸۷، ۱۳۸۸، ۱۳۸۹، ۱۳۹۰، ۱۳۹۱، ۱۳۹۲، ۱۳۹۳، ۱۳۹۴، ۱۳۹۵، ۱۳۹۶، ۱۳۹۷، ۱۳۹۸، ۱۳۹۹، ۱۴۰۰، ۱۴۰۱، ۱۴۰۲، ۱۴۰۳، ۱۴۰

فون کر کے بہ اصرار مجھے اپنے گھر بلواتیں۔ ویسے بھی جشنِ عظمت عبدالقیوم کے بعد میرا اُن کے پاس آنا جانا کچھ زیادہ ہی ہو گیا تھا۔

گورنر آندھرا پردیش شری متی کمودین جوشی، عظمت آپا کا بڑا احترام کرتی تھیں۔ ایک دفعہ کا واقعہ ہے کہ عظمت آپا، شاداں اور میں گورنر صاحبہ سے ملنے کے لئے راج بھون گئے ہوئے تھے۔ جیسے ہی گورنر صاحبہ کو یہ معلوم ہوا کہ عظمت آپا آئی ہوئی ہیں تو وہ عظمت آپا کو لینے کے لئے اپنے چیمبر سے باہر آئیں اور اپنے بازو کرسی پر عزت و احترام سے بٹھائیں اور جب عظمت آپا واپس ہو رہی تھیں تو وہ عظمت آپا کے کاندھے پر اپنا ہاتھ رکھے ہوئے موٹر کے قریب تک تشریف لائیں اور انہیں موٹر میں بٹھا کر واپس ہوتے ہوئے کہا کہ آپ کے لئے راج بھون کے دروازے ہمیشہ کھلے رہیں گے، جس وقت چاہیں بلا روک ٹوک آ سکتی ہیں۔

عظمت آپا کے انتقال سے دو چھینے پہلے ۲۱ مایچ ۱۹۸۷ء کو اُن کے ۴۰ سالہ شعری و ادبی خدمات کے اعتراف کے میں، میں نے جوہلی ہال میں عظیم الشان بیمانے پر اہنستیتی تقریب منعقد کی تھی۔ اس جشن کے موقع پر 'عظمتِ غزل' کے نام سے ایک ضخیم کتاب شائع کی گئی تھی جس کو میں نے مرتب کیا تھا، جس کی رسمِ اجراء گورنر آندھرا پردیش شری متی کمودین جوشی نے انجام دی تھی۔ جلسے کو ڈاکٹر عابد علی خان، مدیر سیاست، جسٹس سردار علی خاں، نواب شاہ عالم خاں اور پروفیسر مغنی تبسم نے بھی مخاطب کیا تھا۔ پروفیسر جلگن ناتھ آزاد نے صدارت کی تھی۔ اس جلسے میں اظہارِ تشکر کرتے

ہوئے عظمت آیا تے میرے بارے میں کہا تھا کہ میں اپنے بھائی صلاح الدین
نیر کی محنتوں کا صلہ تو کچھ نہیں دے سکتی، البتہ میری دعا ہے کہ نیر کو
میری عمر لگ جائے۔

عظمت آیا نے انتقال سے کچھ دن پہلے مجھ سے کہا تھا کہ میں زندہ
رہوں یا نہ رہوں، میرے مضامین کا مجموعہ شائع ہونا چاہیئے۔ حسبِ خواہش
’عظمت خیابان‘ کے نام سے میں نے کتاب شائع کی ہے۔ عظمت آیا کے چار
شعری مجموعے ’زر گل‘، ’رگِ گل‘، ’سفر و سحر‘ اور ’عظمتِ وطن‘ شائع ہو چکے ہیں۔
عثمانیہ یونیورسٹی سے عظمت عبدالقیوم حیات اور کارندے کے عنوان سے
ڈاکٹر اکبر علی بیگ کی زیر نگرانی عبدالوہاب غوری نامی ایک طالب علم ایم فل
کے لئے مقالہ لکھ رہا ہے۔ عظمت آیا کو اس بات کا دکھ تھا کہ اُن کے
خاندان میں شعر و ادب سے دلچسپی رکھنے والے نہیں کھے برابر ہیں۔ بعض دفعہ
مجھ سے ہنستے ہوئے کہتی تھیں کہ میرے ادبی وارث تو آپ ہی ہیں۔

قیوم صاحب کے انتقال کے بعد عظمت آیا بُری طرح ٹوٹ چکی تھیں
تقریباً ۱۲ سال تک وہ بالکل خاموش رہیں۔ میرے مسلسل اصرار اور
شرمیلی روڈا ماستری کی خواہش پر وہ محفلِ خواتین کی سرگرمیوں میں
دوبارہ شامل ہو گئیں۔ اپنی نجی گفتگو میں مجھے شریک کیا کرتی تھیں۔
بہت سے گھریلو معاملات میں مجھ سے مشورہ لیا کرتیں۔ عظمت آیا
کے گھر کی تقریباً ہر تقریب میں میری شرکت لازمی سمجھی جاتی۔ جب
ان کا انتقال ہوا تو میں نے تمام انہب رات میں ان کے سانچہ ارحال

کی خبریں شائع کروائیں۔ تمام اُردو اخبارات میں شہ سُرخیوں کے ساتھ انتقال کی خبر شائع ہوئی۔ محترم محبوب حسین جگر صاحب کی شخصی دلچسپی سے ٹی۔ وی اور ریڈیو سے بھی انتقال کی خبر نشر ہوئی۔ گورنر صاحبہ کی خواہش پر راج بھون سے تمام اخبارات اور نیوز ایجنسیوں کے نام انتقال کی خبر بھجوائی گئی۔ خطہ صالحین دارالسلام روڈ، آغا پورہ میں عظمت آپا کی آخری آرام گاہ ہے۔ کبھی کبھی خطہ صالحین جاتا ہوں اور اُن کی قبر کے قریب خاموش کھڑا ہو جاتا ہوں۔ بھیسگی پلکوں کے ساتھ ذہن میں ماضی کا ایک ایک ورق اُلٹنے لگتا ہے۔



صالحہ الطاف

جیسا کہ میں نے پہلے صفحہ ۲۱۱ میں لکھا ہے کہ بانو طاہرہ سعید نے اپنی قیام گاہ پر ایک پُر تکلف عمرانہ میں کچھ مخصوص شاعروں اور ادیبوں کے ساتھ ساتھ بعض ایسی ممتاز شخصیتوں کو بھی مدعو کیا تھا، جن سے ان کے شخصی مراسم تھے۔ مجھے یاد ہے کہ اُس محفل میں سید ہاشم علی اختر (و اُس چانسلر عثمانیہ دہلی گڈھویہ یونیورسٹی) بھی اپنی فیملی کے ساتھ شریک تھے (جو اُس زمانے میں ڈپٹی سکریٹری جنرل ایڈمنسٹریشن ڈپارٹمنٹ تھے) جناب منظور احمد منظور بھی وہاں موجود تھے۔

صالحہ الطاف سے میری پہلی ملاقات یہیں ہوئی۔ اُس زمانے میں بانو طاہرہ سعید، عفت عبد القیوم اور راجی علی اصغر (جو پاکستان چلی گئیں) کے پاس بھی مخصوص شعری محفلیں ہوا کرتی تھیں۔ اُن محفلوں میں میری شرکت لازمی سمجھی جاتی تھی۔ مجھے اس طرح کے تمام گھرانے پسند تھے۔ نہایت شائستہ، معتبر اور یروقتا شاعر ہونے کے علاوہ یہ تینوں محترم شخصیتیں اپنے خاندانی پس منظر رکھ رکھاؤ اور شخصی وقار کی وجہ سے بھی ممتاز تھیں۔ یہ محترم شاعرات مجھے بہت

ایک پسندیدہ شاعر کے علاوہ ایک مہذب انسان بھی سمجھتی تھیں۔
 بانو طاہرہ سعید نے صالحہ الطاف سے میرا تعارف اس پُر اعتماد اور
 پُر خلوص انداز میں کرایا کہ صالحہ الطاف مجھ سے متاثر ہوئیں اور مجھ سے گھر آنے
 کی خواہش کی۔ صالحہ الطاف کا ”خاتونِ دکن“ منظر عام پر آنے والا تھا۔ بانو
 طاہرہ سعید نے مشورہ دیا کہ نیر صاحب کا تعاون آپ کے رسالے کے لئے
 نہایت مفید رہے گا۔ اُس ملاقات کے کچھ ہی دن بعد رویندر بھارتی تھیٹر
 میں ”خاتونِ دکن“ کے پہلے شمارہ کی رسمِ اجراء تقریب ہوئے والی تھی۔
 رسمِ اجراء تقریب سے ایک دن پہلے صالحہ الطاف کے شوہر الطاف حسین دعوت نامہ
 دینے کے لئے سکریٹریٹ آئے۔ میں اپنی عادت کے مطابق چائے نوشی کے لئے
 کینائٹن لے گیا۔ دورانِ چائے نوشی الطاف صاحب نے دعوت نامہ دیتے ہوئے
 اگلے شمارہ کے لئے غزل کی فرمائش بھی کی۔ میں حسبِ وعدہ دوسرے دن رویندر
 بھارتی تھیٹر چلا گیا۔ رسمِ اجراء تقریب نہایت شاندار پیمانے پر ہوئی۔ اُس
 وقت کے گورنر آندھرا پردیش نے رسمِ اجراء انجام دی تھی۔ میرے خیال میں
 حیدرآباد میں کسی ادبی رسالہ کی تقریب رسمِ اجراء اس شاندار پیمانے پر منعقد نہیں
 ہوئی۔ اس محفل میں حیدرآباد کے بہت سے شاعر، ادیب، صحافی اور ممتاز شہری
 موجود تھے۔ تقریب کے بعد مبارکباد دینے کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ میں
 مبارکباد دے کر خدا حافظ کہنے ہی والا تھا کہ صالحہ الطاف مجھ سے پھر اپنے گھر
 آنے کی خواہش کی۔ میں ۳، ۴ دن کے بعد صالحہ الطاف کے مکان واقع مگر کی
 باولی (میر عالم منڈی) پہنچا۔ جیسے ہی میں نے بل دی، ملازمہ باہر آئی۔ میں نے

اپنا نام بتایا، وہ اندر چلی گئی۔ صالحہ الطاف کو میری آمد کی اطلاع دے کر حسب ہدایت، ڈرائنگ روم میں بیٹھنے کے لئے کہا۔ کچھ ہی دیر بعد صالحہ الطاف آئیں۔ آداب و سلام اور رسمی گفتگو کے بعد خاتونِ دکن کے بارے میں گفتگو رہی۔ رسالہ کے سلسلہ میں اس پہلی تفصیلی گفتگو کے دوران صالحہ الطاف نے مجھ سے کہا کہ انہوں نے مجھے پہلی دفعہ ڈاکٹر اختر احمد کے مکان میں منعقدہ ایک مشاعرہ میں کلام سناتے ہوئے دیکھا تھا۔ (ڈاکٹر اختر احمد نے ان کے خاندانی مراسم تھے) صالحہ الطاف نے مجھ سے یہ بھی کہا کہ ڈاکٹر اختر احمد نے انہیں مشورہ دیا تھا کہ پرچہ کی اشاعت، ترتیب و تزئین کے سلسلہ میں مجھ سے تعاون حاصل کریں۔ ڈرائنگ روم کی اس نشست میں صالحہ الطاف نے مجھ سے تعاون کی خواہش کی۔ میں نے وعدہ کرتے ہوئے پرچہ کی اشاعت کی ذمہ داری قبول کی۔ میں نے یہ بھی کہا کہ اگر آپ مجھ پر اعتبار کر سکتی ہیں تو میں چاہوں گا کہ رسالہ کی اشاعت کی ساری ذمہ داری مجھے سونپ دیں۔ البتہ تخلیقات کے انتخاب اور دیگر انتظامی امور میں ہم دونوں کا مشورہ شامل رہے گا۔ میں نے یہ بھی واضح کر دیا کہ میں بلا معاوضہ کام کروں گا، مجلسِ ادارت میں بھی میرا نام نہیں رہے گا۔ اُس وقت ۱۴ کتابیں رسالہ کی کتابت کرتے تھے۔ میں نے کتابت کے لئے محمد مظہر صاحب سے گفتگو کی۔ رسالہ بند ہوتے تک صرف انہوں نے ہی کتابت کی۔ مظہر صاحب اُن دنوں حیدرآباد کے ایک معیاری ادبی رسالہ ماہنامہ ”صب“ کی کتابت کرتے تھے، وہ روزنامہ نظام گزٹ سے بھی وابستہ تھے (میرے پہلے مجموعہ کلام ”گلِ تازہ“ کی کتابت بھی مظہر صاحب نے ہی کی ہے۔ خاتونِ دکن بلا وقفہ تقریباً

۱۲ سال تک شائع ہوتا رہا۔ جب میں نے خاتونِ دکن کا مکمل جائزہ حاصل کیا۔ تو صالحہ الطاف سے یہ بھی کہا کہ شاعروں اور ادیبوں سے میں خود خط و کتابت کروں گا، آپ کو ترہمت کرنے کی ضرورت نہیں، چنانچہ میں نے اردو کے نئے اور پرانے قلم کاروں کو خطوط لکھے اور مجھے ان کا تعاون حاصل ہوتا رہا۔ مجھے صالحہ الطاف نے بتایا کہ خاتونِ دکن کی اشاعت کے سلسلہ میں حیدرآباد کے بعض شاعروں اور ادیبوں نے اپنے طور پر تعاون کا پیش کش کیا تھا لیکن ترجیحاً میں نے آپ کو اہمیت دی ہے۔ آپ میں نے کچھ ایسی بات محسوس کی ہے کہ میں آپ پر بھروسہ کر سکتی ہوں۔ جب پرچہ کا کام بڑھنے لگا تو مجھے اکثر دفعہ صالحہ الطاف کے گھر جانے کا اتفاق ہونے لگا (چونکہ خاتونِ دکن کا آفس اُن کے گھر میں تھا) اُن دنوں صالحہ الطاف کو اُن کی تمام چھوٹی بہنیں، اختر سلطانہ، صبیحہ سلطانہ، صابرہ سعید اور عذرا سعید باجی کہا کرتی تھیں۔ اُن کے بھائی سلطان محمود، اور صمد فاروقی بھی باجی ہی کہا کرتے تھے لیکن میں نے اپنی الگ شناخت کیلئے باجی کے بجائے صالحہ آپا کہنا پسند کیا۔ آج بھی میں اس مقدس، پاکیزہ، اٹوٹ رشتہ سے وابستہ ہوں۔ رفتہ رفتہ مجھے اُس گھر سے کچھ ایسا تعلق پیدا ہو گیا کہ جیسے میں اُس گھر کا ایک فرد ہوں اور وہ لڑکیاں میری حقیقی بہنیں ہیں۔ صالحہ آپا کے غیر معمولی اعتماد نے مجھ پر کچھ اس قدر گہرا اثر چھوڑا کہ میں خاتونِ دکن کی بہترین سے بہترین اشاعت اپنے آپ کو وقف کر دیا۔ صالحہ آپا نے مجھے مکمل اختیار دیا تھا کہ میں پرچہ کو اپنے ڈھنگ سے شائع کروں لیکن مجھے ہمیشہ اُن کا مشورہ اور تعاون حاصل رہتا تھا۔ رسالہ کا جائزہ لینے کے بعد میں نے کسی

وقت بھی صالحہ آپا کو پریس کے چکر لگانے کی زحمت نہیں دی، نہ ہی شاعروں اور ادیبوں سے خط و کتابت میں الجھایا۔ رسالہ کا سارا کام وہ گھر پر ہی دیکھ لیا کرتی تھیں۔ ایک دن صالحہ آپا نے شاعروں اور ادیبوں کے وہ سینکڑوں خطوط دکھائے جو ان کے نام آئے تھے۔ میں نے ان تمام خطوط کو تلف کیا اور نئے سرے سے کام کا آغاز کیا۔ میں نے جب خطوط لکھنا شروع کیا تو مجھے حوصلہ افزاء تعاون حاصل ہوتا رہا۔ ملک بھر کے نمائندہ شاعروں اور ادیبوں کے قلمی تعاون سے پرچہ دن بہ دن مقبول ہوتا گیا۔ اس پرچہ کو نام کی مناسبت سے صرف خواتین کی تخلیقات کے لئے ہی مختص نہیں کیا بلکہ خاتونِ دکن کو خالص ادبی رسالہ کی شکل دی گئی (جس میں مرد و خواتین قلم کاروں کی تخلیقات شائع ہوتی تھیں)۔ میری فرض شناسی اور احساسِ ذمہ داری کو صالحہ آپا نے ہمیشہ سراہا اور پرچہ کی اشاعت میں مجھ سے مکمل تعاون کیا۔ ہر ادبی رسالہ کی بقا کے لئے اشتہار ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اگر اس سلسلہ میں الطاف بھائی کا بھرپور تعاون حاصل نہ ہوتا تو شاید یہ پرچہ ۱۲ سال تک جاری نہ رہ پاتا۔ میں تقریباً ہر شام خاتونِ دکن کے آفس جاتا اور ذمہ داری کے ساتھ اپنے فرائض انجام دیتا۔

صالحہ آپا کی والدہ محترمہ میرا بہت خیال رکھتی تھیں (خدا انہیں جنت نصیب کرے) اس گھرانے نے مجھے پیار، محبت اور بے لوث خلوص سے سرشار کیا۔ اس گھر کے ماحول نے مجھے اس بات کا احساس ہی ہونے نہیں دیا کہ میں اس گھر کے لئے ایک اجنبی ہوں۔ میں خوشیوں، مسرتوں کے علاوہ اس گھر کے

دکھ درد میں بھی برابر کا شریک رہا ہوں۔ صالحہ آپا نے اپنی بے لوث چاہت اور سچے خلوص میں کبھی کمی نہیں کی۔ اُن سے جیب کبھی بھی ملتا ہوں تو مجھے شدت سے یوں محسوس ہوتا ہے کہ میں ایک مہذب، شائستہ خاتون سے مل رہا ہوں جنہوں نے اپنے منہ بولے بھائی کے لئے اپنی ساری محبت، ساری شفقت پنچاور کردی ہے۔ صالحہ آپا کو شدت سے اس بات کا احساس تھا کہ میں خاتونِ دکن کا کام نہایت ذمہ داری اور اپنائیت کے ساتھ کر رہا ہوں۔ انہیں اس بات کا بھی احساس تھا کہ میں انہیں بہت چاہتا ہوں، اتنا زیادہ کہ خونی رشتے بھی ہاتھ ملکتے رہ جائیں۔ صالحہ آپا کی ہمیشہ یہ کوشش رہتی کہ خاتونِ دکن کا بلا معاوضہ کام کرنے کے صلے میں مجھے تحفہ ہی نہیں کچھ نہ کچھ ملتا رہے (لیکن میں نے انہیں اس بات کی اجازت نہیں دی)۔ اس کے باوجود صالحہ آپا نے غیر محسوس طریقہ سے مجھے ایک ایسے مقام پر شکست دیدی کہ میری ساری آنا اور خود داری دیکھتے ہی دیکھتے ختم ہو گئی۔ صالحہ آپا نے مجھ پر اتنا بڑا احسان کیا کہ میں ہمیشہ کے لئے اُن کے احسانات کے نیچے دب کر رہ گیا۔

معاشرہ میں اُن رشتوں کی زیادہ قدر کی جاتی ہے جو انسانی زندگی میں غیر محسوس طریقے سے مختلف اوقات میں، مختلف انداز اور مختلف روپ میں ظہور پذیر ہوتے ہیں۔ (کائنات کے سارے کاروبار ایسے ہی نازک رشتوں پر قائم ہیں)۔

اللہ کا احسان ہے کہ میں معاشی طور پر ہمیشہ مطمئن رہا۔ سب کچھ ہوتے ہوئے بھی میں نے یہ طے کیا تھا کہ اپنی زندگی اپنے انداز سے گزارنی چاہیے۔

میں نے اپنی ساری زندگی میں نہ تو کسی کے سامنے سر جھکایا، نہ دستِ سوال دراز کیا۔ ہمیشہ اپنی خودداری کا بھرم قائم رکھا۔ اس کے باوجود بعض نازک و لطیف رشتوں نے مجھے بعض دفعہ مشکل مراحل سے بھی دوچار کیا، پھر بھی میں نے حالات سے سمجھوتہ نہیں کیا۔ یہ بات صالحہ آپا جانتی تھیں کہ میں کس قدر خوددار انسان ہوں۔ صالحہ آپا اس کوشش میں رہتیں کہ میری زندگی کے صبح و شام آسودگی کے ساتھ ساتھ باوقار اور پُر اعتماد انداز سے گزرتے رہیں۔ معاشی طور پر میں اور زیادہ مستحکم رہوں۔ میرے بارے میں وہ ہمیشہ کچھ نہ کچھ سوچتی رہتیں۔ اُن ہی دنوں میرا پہلا لڑکا شمس الدین عارف، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے فرسٹ ڈیویژن میں ایم۔ ایس سی کامیاب ہوا۔ عارف کی یہ خواہش تھی کہ وہ آئی۔ اے۔ ایس کے امتحان کی تیاری شروع کر دے یا ڈاکٹریٹ کی تکمیل کے لئے اپنے ماموں کے ہاں امریکہ چلا جائے۔ حیدر آباد میں الطاف بھائی نے عارف کو کچھ جیتے اپنے بزنس میں شامل کر لیا۔ اُس نے ذمہ داری سے اپنا کام شروع ہی کیا تھا کہ الطاف بھائی دوحہ قطر چلے گئے اور صالحہ آپا نے جانے کے بعد یہاں کام یہ کیا کہ عارف کو دوحہ قطر بلوانے کی راہ فراہم کی۔ اُس وقت (۱۰ سال پہلے) ایک ویزا کے حصول کے لئے تقریباً ۲۵ ہزار روپے خرچ ہو کر تے تھے لیکن صالحہ آپا نے میری محنت، میرے خلوص کا پُر اثر انداز بھی جواب دیا۔ عارف کے لئے ایک کمپنی میں ملازمت کا انتظام کیا، ایک دن عارف کا ویزا اور ہوائی جہاز کا ٹکٹ آگیا اور وہ دوحہ قطر چلا گیا۔ یہ سب کچھ کمپنی کی جانب سے ہوا، عارف کا کچھ خرچ نہیں ہوا۔ آج الحمد للہ عارف کی ملازمت کی وجہ سے ہمیں عمری ضروریات کی وہ تمام

سہولتیں جیسا ہیں جو ایک خوشحال گھرانے کے لئے ضروری سمجھی جاتی ہیں۔ عارف
کیمپنی کے ایک منبر کی حیثیت سے پُرسکون اور مطمئن زندگی گزار رہا ہے۔

میری منہ بولی بعض بہنوں کا خیال ہے کہ میں جب کسی کو زیادہ چاہتا ہوں تو
مجھے اُن سے لڑنے میں کچھ زیادہ ہی لطف آتا ہے۔ صالحہ آپا سے کبھی کبھی میں
الٹجتا رہتا تھا، یہ بات گھر کے سبھی لوگ جانتے تھے۔ ایک دفعہ میری اہلیہ نے
بتایا کہ صالحہ آپا کی والدہ تجھے بہت عزیز رکھتی ہیں۔ وہ کچھ رہی تھیں، نیر میاں
صالحہ سے کبھی کبھی اُلکھتے رہتے ہیں، عفا خفا سے رہتے ہیں، اس کے باوجود وہ
صالحہ کے پاس آتے ہیں۔ تیسریں بڑی محبت والے، میرے گھر کے ایک

فردِ خاندان کی طرح۔ ایک دن صالحہ آپا اور اُن کے گھر کے لوگوں نے جب یہ جانا
چاہا کہ میرے گھر میں کون کون رہتا ہے، تو ایک روز ابتدائی تعارف کے طور
پر میں نے اپنے تیسرے لڑکے منہاج الدین خسرو کو (جو اُس وقت اکیس سال کا ہوگا)
صالحہ آپا کے گھر لے گیا اور اس کو دروازہ پر چھوڑ دیا۔ منہاج الدین خسرو کم سنی
میں بے غرضی اور صحت مند تھا (آج بھی وہ ویسا ہی ہے) جب وہ گھر
میں داخل ہو تو توجہ خوشی سے گھر کے تمام لوگ اُس کو پیار کرنے لگے، پھر
انہوں نے یہ جاننا چاہا کہ اتنے خوبصورت بچہ کو کون چھوڑ گیا ہے۔ بچہ کو

گھر کے دروازہ پر چھوڑ کر میں خاموشی سے ڈرائنگ روم میں بیٹھ گیا تھا۔ جب
گھر والوں کو یہ معلوم ہوا کہ میرا لڑکا ہے تو صالحہ آپا نے ایک تحفہ اُس کے ہاتھ میں
تھمایا اور پھر اُسے میرے پاس لے آئیں۔ منہاج کو خوب پیار کیا۔ منہاج تھا
بھی اس قدر خوبصورت، پُرکشش اور صحت مند کہ جو بھی اُس کو دیکھتا اُس سے پیار

کرنے لگ جاتا۔ میرے خاندان سے اُس پہلے تعارف کے بعد میری اہلیہ صالحہ
آپا کے گھر کبھی کبھی جایا کرتیں۔ (خاص خاص موقع پر)

اتنے طویل عرصہ کے بعد بھی صالحہ آپا کی محبت اور اُن کے سلوک میں

ذرا برابر بھی کمی نہیں آئی۔ صالحہ آپا بعد میں میرے علمی و ادبی کاموں میں
دلچسپی لینے لگیں۔ میری شاعری کا جہاں وہ مداح ہیں وہیں وہ مبصر اور
نقاد بھی ہیں۔ میرے پہلے مجموعہ ”گل تازہ“ کی ترتیب و تزئین کی ساری
ذمہ داری صالحہ آپا نے اپنے سر لی تھی۔ ایک ایک غزل کا جائزہ لیا اور مناسب
انداز سے مجموعہ ترتیب دیا۔ کتاب کو مزید دیدہ زیب بنانے کیلئے اپنی چھوٹی اور ٹسٹ
بہن عذرا سعید سے مرقعے بنوائے، مرقعوں کی مناسبت سے مجھ سے شعر کہلوا۔

بہترین سرورق تیار کروایا اور بہترین گٹ آپ کے ساتھ ”گل تازہ“ شائع
ہوا۔ صالحہ آپا کے مشورہ سے کتاب کی قیمت صرف ایک روپیہ رکھی گئی تاکہ
کتاب زیادہ سے زیادہ لوگوں کے ہاتھوں میں رہے۔ کتاب کی ایک ہزار جلیں
دو ڈھائی جینے میں آؤٹ آف اسٹاک ہو گئیں۔ صالحہ آپا نے ”گل تازہ“ کی تقریباً
تمام غزلیں مصرع طرح دے کر نکھوائیں۔ صالحہ آپا کو شعر و سخن کا نہایت عمدہ
اور نکھر استھرا ذوق ہے، یہ ذوق انہیں اپنے ورثے میں ملا ہے۔ صالحہ آپا کے
والد محترم احمد سعید صاحب علی گڑھ کے فارغ التحصیل تھے، یو وائی میں

سنگ سیلو کے تاجر اور معدنیات کے مالک تھے۔ روزنامہ ”میزان“ کے
ایڈیٹر حبیب اللہ اوج، صالحہ الطاف کے حقیقی چچا ہیں (جو پاکستان کے شہری
ہیں)۔ صالحہ الطاف کا سارا گھرانہ اعلیٰ تعلیم یافتہ ہے۔ سارے گھر پر مشرقی آداب

اویسی کا گہرا اثر ہے۔ وہ ایک اچھی ادیب اور ڈرامہ نگار بھی ہیں۔ ادبی و مذہبی کتبوں کا وسیع مطالعہ ہے، ان کا زیادہ وقت ادبی و دینی کتب کے مطالعہ میں گزرتا ہے۔ نہایت بُرد بار، سنجیدہ، سلیقہ شعار اور پُر وقار شخصیت رکھتا ہے۔ میرے تمام شعری مجموعوں کی ترتیب و تزئین میں صالحہ آپا کی مشاورت شامل رہی ہے۔ الطاف بھائی ایک بزنس مین ہیں انہیں ایک بیٹا اور دو بیٹیاں ہیں۔ سید اویس سرمد سوئزر لینڈ میں چارٹرڈ اکاؤنٹنٹ ہے۔ اُس نے ایک نہایت خوب صورت و خوب سیرت اسپینش اسپین کی رہنے والی لڑکی مریم سے شادی کی ہے۔ الطاف بھائی کی پہلی لڑکی نوشینہ اریٹب ڈاکٹر ہے، جو بنگلور میں مقیم ہے، دوسری لڑکی شمیرہ اسمی بی۔ ڈی ایس کی طالبہ ہے، یہ بھی بنگلور میں مقیم ہے۔ صالحہ آپا ان دنوں محلہ اے سی گارڈ کے ایک مکان میں رہتی ہیں، الطاف بھائی کا آفس بھی اسی گھر میں ہے۔ الطاف بھائی اور صالحہ آپا میں ذہنی ہم آہنگی ہے، وہ ایک دوسرے کو بہت چاہتے ہیں، نہایت مطمئن زندگی گزار رہے ہیں۔ میں نے اپنے جذباتی اور پاکیزہ رشتہ کے تسلسل کی برقراری کے لئے اپنے ۸ ویں مجموعہ کلام ”یہ کیسا رشتہ ہے“ کا انتساب صالحہ آپا کے نام کیا ہے۔



رخسانہ (ڈاکٹر صابرہ سعید)

۱۳، ۱۵ برس کی مشرقی ماحول کی پروردہ ایک سنجیدہ، عقیق، خوش جمال اور خوش مزاج سیدی سادی لڑکی رخسانہ کو میں نے پہلی بار اُس وقت دیکھا جب وہ چھ پچھن کے لئے گھر سے باہر آئی تھی کہ صالحہ باجی گھر پر نہیں ہیں اور یہ کہا ہے کہ آپ کو ڈرائنگ روم میں بٹھا دوں۔ میں ڈرائنگ روم میں بیٹھا انتظار کرتا رہا۔ اُس وقت رخسانہ اسکول کا ڈریس دگرین شرٹ اور سفید پاجامہ، زیب تن کئے ہوئی تھی۔ عثمانیہ میٹرک اور علی گڑھ میٹرک کی تیاری ایک ساتھ کر رہی تھی۔ صالحہ آپا سے جو میرا رشتہ ہے اُس کی توسیع کے لئے صبیحہ، رخسانہ اور عذرا بھی مجھے نیتربھائی کہا کرتی تھیں۔ صبیحہ، صالحہ آپا کی تیسری چھوٹی بہن ہے (جو امریکہ میں رہتی ہے) صبیحہ استاد سے کم آمیز رہی۔ البتہ رخسانہ اور عذرا مجھ سے ملتی رہتی تھیں۔ رخسانہ کا ترنم بے حد پُر اثر ہے۔ رخسانہ کے ترنم کا جھ پر گہرا اثر ہے۔ میں اپنی بعض غزلیں اب بھی رخسانہ کے ترنم میں سُنا رہا ہوں۔ عذرا ایک بہت اچھی آرٹسٹ ہے۔ سیر تمام شعری مجموعوں کے سرورق عذرا نے ہی تیار کئے ہیں۔ (اُس نے جامعہ عثمانیہ سے سوشل لوجی میں ایم۔ اے کیا ہے، جدید لب و لہجہ کی شاعرہ بھی ہے)۔ میں اپنی بہنوں کی

چھوٹی چھوٹی فرمائشوں اور خوشیوں کا خیال رکھتے ہوئے ان کے لئے اچھی اچھی کت میں لے آتا۔ جب میں عثمانیہ یونیورسٹی سے بی۔ اے۔ ایل کے امتحان کی تیاری کر رہا تھا تو رخصانہ مجھے انگلش کے نوٹس تیار کر کے دیا کرتی تھی۔ خاندان کی دوسری لڑکیوں کی طرح رخصانہ کبھی شادی ہو گئی اور وہ سسرال چلی گئی۔ بہن چاہے میکے میں رہے یا سسرال میں، بھائی بہن کا رشتہ کبھی ٹوٹتا نہیں اور مستحکم ہو جاتا ہے۔ رخصانہ کی شادی ۱۷، ۱۸ سال کی عمر میں ہوئی تھی۔ شادی کے بعد رخصانہ نے جامعہ عثمانیہ سے اُردو میں ایم۔ اے کیا۔ پروفیسر مغنی تبسم بھی ان کے اُستادوں میں شامل تھے۔ ایم۔ اے کرنے کے بعد رخصانہ نے بی۔ ایچ ڈی میں داخلہ لیا۔ پروفیسر غلام عمر خان اُس کے گائیڈ تھے لیکن مقالہ کی تکمیل کے تمام مرحلے مغنی تبسم کی مشاورت اور تعاون سے انجام پائے۔ مقالہ کی ترتیب و تزئین اور ٹائپ کے مرحلوں میں، میں نے رخصانہ کا ساتھ دیا۔ رخصانہ کو پی۔ ایچ ڈی کی ڈگری مل گئی۔ رخصانہ کی بہن اختر سلطانہ کے گھر واقع بشیر باغ پر ایک پُر تکلف عصرانہ دیا گیا تھا جس میں پروفیسر گیان چند جین ڈاکٹر غلام عمر خان، ڈاکٹر مغنی تبسم، سیمع بھائی اور خاندان کے دیگر اصحاب موجود تھے۔ وہ شام بڑی خوشگوار تھی۔ محسوس ہو رہا تھا کہ ایک ہی خاندان کے لوگ برسوں بعد ایک جا۔ جمع ہو گئے ہیں۔

اُس زمانے میں سکریٹریٹ کے محکمہ تعلیمات سے اُردو مسودات اور مقالوں کی اشاعت کے لئے بھی گرانٹ دی جا رہی تھی (میں اُن دنوں سکریٹریٹ میں تھا) میں نے رخصانہ کا مقالہ اُردو ادب میں خاکہ نگاری، گرانٹ کے لئے پیش

کیا تھا جس کی اشاعت کے لئے ۴ ہزار روپے حکومت نے منظور کئے تھے۔
 میں نے مقالہ کو کتابی شکل دینے کی راہ نکالی۔ کتاب شائع ہو گئی جس پر اتر پردیش
 اُردو اکیڈمی نے انعام سے نوازا۔ ڈاکٹریٹ کے بعد رخصانہ نے اپنا علمی و ادبی کام
 جاری رکھا۔ اکل انڈیا ریڈیو حیدرآباد سے اُردو ادب کے مختلف موضوعات
 پر تقریریں نشر کرتی رہیں۔ دور درشن سے مباحث میں حصہ لیا۔ روزنامہ سیاست
 کے علاوہ ملک کے ادبی رسائل میں خاکہ نگاری کے مختلف پہلوؤں اور دیگر ادبی
 موضوعات پر مضامین شائع ہوتے رہے۔ رخصانہ تقریباً ۵ سال تک شعبہ اُردو
 جامعہ عثمانیہ سے وابستہ رہیں۔ شہر کے مختلف کالجس میں پارٹ ٹائم پکچر کی
 حیثیت سے درس دیتی رہیں۔ اس وقت سلطان العلوم کالج آف ایجوکیشن میں
 ایک پکچر کی حیثیت سے کام کرتی ہیں۔ رخصانہ شاعری بھی کرتی ہیں لیکن
 چھپوانا نہیں چاہتیں۔ رخصانہ کی شخصیت میں وہ تمام اعلیٰ خصوصیات شامل
 ہیں جو ایک جذب، شائستہ اور باوقار خاتون کا حصہ ہوتی ہیں۔

رخصانہ کم عمر ہی میں اپنی زندگی کے پہلے اور آخری سا کھتی سے ہمیشہ ہمیشہ
 فیملے محروم ہو گئیں۔ جب یہ المناک ناقابل یقین المیہ پیش آیا تو رخصانہ بری
 طرح ٹوٹ گئیں۔ اس کو سنبھلنے کے لئے کئی برس لگے۔ سمیع بھائی ایک کامیاب
 شاعر، کامیاب دوست اور ایک اعلیٰ درجے کے انسان تھے۔ نہایت وجہیہ
 معتبر، نفیس اور ہنس مکھ شخصیت کے مالک بھی۔ اُن میں ایسا بائپن تھا کہ
 اُن پر جب نظر جم جاتی تو ہنسی ہی نہیں تھی۔ وہ عین عالم جوانی میں (لگ بھگ ۴۰،
 ۴۲ سال) کی عمر میں گردے کے عارضہ میں مبتلا ہو کر ایہی نیم سو گئے۔ وہ

ہم سے رحمت ہوئے تو ازمان (محمد خلیل اللہ) رخصتہ کی انگلی تھامے ہوئے
 کھڑا تھا اور عرشہ یقیس، رخصتہ کی گود میں تھی۔ رخصتہ نے زندگی کا باقی طرہ
 سفر تنہا طے کرتے کچے لئے اسی وقت عہد کیا تھا جب سمیع بھائی کی نظروں
 آخری بار رخصتہ کو دیکھتے ہوئے ہمیشہ کے لئے بند ہو گئیں۔ سمیع بھائی
 میری بہت عزت کرتے تھے۔ جب میں رخصتہ کے ادب کا مول اور اس کے
 کالج کی مصروفیات میں دلچسپی لیتا تو انہیں بہت خوشی ہوتی تھی۔ میرے
 خلعخانہ رویے سے وہ یہ محسوس کرتے تھے کہ سلطان محمود اور صد فاروقی
 کی طرح میں بھی ان کا نسبتی برادر ہوں۔

میں اب بھی رخصتہ سے ملنے کے لئے اُس کے گھر جایا کرتا ہوں، اُس کا
 خال پوچھتا ہوں، اسی طرح جیسے ایک بھائی کی ذمہ داری ہوتی ہے۔ میں اُس
 اتھو ہناک لمحہ کو آج تک بھول نہیں پایا جب میں پُرسہ دینے کے لئے
 رخصتہ کے گھر گیا تھا تو اُس نے مجھے بھی اپنی طرح آنسوؤں کے سمندر میں
 ڈبو دیا تھا۔



فاطمہ نسرین

ہر شخص کو اپنی زندگی میں کچھ ایسے انسانی رشتوں سے بھی تعلق رہتا ہے جن کو کوئی خاص نام نہیں دیا جاسکتا۔ بظاہر بعض رشتے اس قدر اعلیٰ و ارفع ہوتے ہیں کہ جن کی شناخت سے بھی رشتوں کا وقار متاثر ہوتا ہے۔ ایسے ہی ایک رشتہ سے مجھے بھی سابقہ پڑا تھا۔ اُس رشتہ کو کوئی ایک اچھا سا نام دینے کے لئے مجھے بہت دن لگے اور اُس رشتہ کی پاکیزہ شکل فاطمہ نسرین ہے۔ گل تازہ کی طرح ہنسنے والی شخصیت نے مجھے کچھ اس طرح متاثر کیا تھا کہ میں نے اُس ایک رشتہ میں تمام انسانی رشتوں کو تسبیح میں پروئے ہوئے دنوں کی طرح پایا۔

فاطمہ نسرین سے میری پہلی ملاقات ویمینس کالج، سلطان بازار، کوٹھی کے اسٹاف روم میں اُس وقت ہوئی جب میں صدر بزم اُردو ویمینس کالج، سے ملنے کے لئے گیا تھا۔ میرے ہمراہ نظام کالج کے طالب علم صادق نقوی (ڈاکٹر صادق نقوی) ریڈر شعبہ تاریخ جامعہ عثمانیہ) بھی تھے۔ چونکہ میں پہلی دفعہ ویمینس کالج جا رہا تھا، اس لئے صادق نقوی میرے ساتھ تھے۔ وہ ڈاکٹر ثیمینہ شوکت سے واقف تھے، مجھے معلوم تھا کہ بزم اُردو کی نشستیں پکڑنے والے ٹھکانے شوکت

ہیں۔ میں اُن دنوں اُردو کالج میں بی۔ او۔ ایل کا طالب علم تھا اور بزم اُردو ادب کا صدر بھی۔ بین کلیاتی بیت بازی کے مقابلے میں شرکت کی دعوت دینے کے لئے میں گیا تھا۔ اُردو کالج میں اُن دنوں بین کلیاتی بیت بازی کے مقابلے منعقد ہوتے والے تھے۔ جب میں نے ٹیمینہ شوکت صاحبہ سے خواہش کی کہ میں صدر بزم اُردو وینس کالج سے ملتا چاہتا ہوں تو انہوں نے فاطمہ نسرین کو بلا بھیجا اور مجھ سے تعارف کرواتے ہوئے کہا کہ یہ فاطمہ نسرین ہیں۔ یہی صدر بزم اُردو ہیں۔ مختصر تعارف کے بعد وینس کالج کی ٹیم کی تفصیل حاصل کرنے کے بعد جب میں لوٹ رہا تھا تو یوں محسوس ہوا کہ اس لڑکی سے میرا کسی نہ کسی قسم کا رشتہ ہے۔ فاطمہ نسرین اپنی ٹیم کے ساتھ اُردو کالج آئیں۔ دوسری ملاقات کچھ دنوں بعد ہی ”محمد قسلی قطب شاہ تقاریب“ کے سلسلہ میں ہوئی جہاں بیت بازی کا فائنل مقابلہ منعقد ہونے والا تھا۔ مجھے پھر وینس کالج جانا پڑا۔ فاطمہ نسرین سے ملاقات ہوئی۔ کچھ دن گزرنے کے بعد فاطمہ نسرین نے میرے نام اپنے کالج کی سالانہ تقریب کا دعوت نامہ بھیج دیا۔ میں اپنے آفس (سکریٹریٹ) کے ساتھی افضل حسین (ممتاز کاظمی) کو ساتھ لے کر اُس وقت وینس کالج پہنچا۔ یہ فائنل ٹیم ہو چکا تھا۔ مختلف کالجوں کے طلباء و طالبات اور اساتذہ واپس ہو رہے تھے۔ سب سے آخر میں جانے والی آسٹریائی ٹیم۔ فیو سلطانہ فیصل۔ فاطمہ نسرین دربار ہال کی بائیں جانب کی سیڑھیوں کے پاس ٹھہری ہوئی تھیں۔ جیسے ہی میں پہنچا ان کے چہرے پر مسکراہٹ کی ہر دو گئی اور مجھے اپنے ہمراہ ریفرشمنٹ روم میں لے گئیں، وہاں ہم نے پینا پلائی۔

وینس کالج کی سالانہ تقریب سے پہلے محمد قسلی قطب شاہ تقاریب کے سلسلے میں گنبد محمد قسلی قطب شاہ پر بیت بازی کا فائنل مقابلہ تھا جس میں وینس کالج کی ٹیم نے مقابلہ جیت لیا۔ اُردو کے ممتاز محقق ڈاکٹر سید محی الدین قادری نے مجھے ان مقابلوں کا کنوینسز مقرر کیا تھا۔ جگن ناتھ آزاد نے اقبال کا ایک شعر سن کر بیت بازی کے مقابلہ کا آغاز کیا تھا۔ جب ہم پنج کے لئے جمع ہوئے تو ان لڑکیوں کے پاس صرف کاپیاں، کتابیں اور قلم تھے (کھانے کیلئے کچھ بھی نہیں تھا) میں نے انہیں پنج میں شریک ہونے کے لئے اصرار کیا۔ فاطمہ نے مجھ سے کہا کہ ہمارے پاس ٹفن ہے، جب میں نے ٹفن باکس دیکھنا چاہا تو میرے ہاتھ سے ڈبہ گر گیا۔ ڈبہ میں فوٹن پین، پینسل اور کچھ روپے تھے۔ اس کے سوا کچھ بھی نہ تھا۔ میں نے ان لڑکیوں کو بہ اصرار پنج میں شریک کیا۔ جب تقسیم انعامات کا سلسلہ ختم ہوا تو اُس وقت شام کے کوئی بارے بج رہے تھے۔ تقریب ختم ہونے کے بعد ان لڑکیوں کو پہنچانے کی میری ذمہ داری تھی۔ غالب چاند کی ۳۳ ویں یا چودھویں تاریخ تھی، بس کے لئے ہمیں گنبد محمد قسلی قطب شاہ سے بالا حصار تک پیدل جانا پڑا۔ اُس وقت چاندنی زمین پر دودھ کا دریا بہا رہی تھی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے ہم لوگ دودھ کی چادر میں لپٹے ہوئے ہیں۔

کالج کی وداعی تقریب کے بعد فاطمہ سے میری یہ آخری ملاقات تھی فاطمہ نے بی۔ اے کرنے کے بعد جامعہ عثمانیہ میں ایم۔ اے جغرافیہ میں داخلہ لے لیا۔ تقریباً ایک سال تک فاطمہ سے ملاقات نہیں ہوئی۔ ایک دن ہاشم حسن نے

کے ذریعہ ایک چھٹی ملی۔ ہاشم نے وہ چھٹی مجھے اردو کالج کے ایک فنکشن کے دوران دی تھی۔ فاطمہ نے گھر آنے کے لئے لکھا تھا۔ میں فاطمہ کے گھر گیا، اُس کو میری سے بہت خوشی ہوئی۔ فاطمہ نے مجھ سے خواہش کی تھی کہ میں اُس کی چھوٹی بہن فرخ کے لئے بی۔ اے، اردو کے نوٹس تیار کروں، چونکہ امتحان قریب تھے اس لئے میں نے رات دیر تک جاگ جاگ کر نوٹس تیار کئے۔ فرخ اچھے نمبرات لے کر ساتھ پاس ہو گئی۔ اس کے بعد مجھے کسی نہ کسی کام کے سلسلے میں فاطمہ سے ملنے کے لئے جانے کا اتفاق ہوتا رہا۔ اب ہمدانی ملاقاتیں اور بڑھنے لگیں۔ فاطمہ نے نیم۔ اے میں داخلہ لے لیا تھا۔ ایم۔ اے کے ایک پیرچہ کے سلسلے میں کچھ فارسی مخطوطات دیکھنا ضروری تھا۔ فاطمہ، یونیورسٹی سے اسٹیٹ لائبریری آتی اور میں وہاں موجود رہتا۔ میں نے اُس زمانے میں فاطمہ کی بہت مدد کی۔ فاطمہ فارسی سے ناواقف تھی اور میں فارسی جانتا تھا، اس لئے میرا تعاون اُسے درکار تھا۔ کبھی کبھی میں عثمانیہ یونیورسٹی بھی چلا جاتا۔ ایک دفعہ یوں ہوا کہ میں فاطمہ نسرین سے ملنے کے لئے جغرافیہ ڈپارٹمنٹ پہنچا گیا۔ فاطمہ کی کلاس چل رہی تھی، ایسے ہی میں کلاس میں داخل ہوا، متعلقہ پروفیسر نے سوال کیا، آپ کو کس سے ملنا ہے۔ میں نے اشارہ کرتے ہوئے بتایا کہ، فاطمہ سے۔ یہ میری بہن ہے۔ فاطمہ کلاس روم سے باہر آئی اور مجھ سے کہا، یہاں مختلف رشتوں کے نام سے طالب علم آتے ہیں اور طالبہ سے ملتے رہتے ہیں۔ اس لئے اساتذہ کے ذہن میں مختلف سوالات ابھر کر آتے ہیں۔ آپ تو میرے بھائی ہیں۔ فاطمہ کے اس آخری جملہ نے میری نس نس میں خوشبو کی لہر دوڑادی۔ فاطمہ کے دو بھائی ہیں۔ دونوں

گزیٹڈ پوسٹ پر تھے۔ انگریجو آفیسر ہونے کی وجہ سے وہ دونوں زیادہ تر اضلاع پر رہتے تھے۔ فاطمہ کو ایک بھائی مل گیا۔ وہ اس بھائی کی بے حد لگو ہو گئی تھی وہ اپنی زندگی کے ہر مرحلہ پر مجھ سے مشورہ کرتی۔ فاطمہ کو اردو شعر و ادب کا اچھا خاصہ ذوق ہے، وہ شعر بھی کہتی ہے۔ سرتین تخلص ہے۔ اس تخلص کو حیات جاوید بخشے کے لئے میں نے اپنی چھوٹی لڑکی کا نام زینت سرتین رکھا ہے۔ میری پہلی لڑکی طلعت سلطانہ فاطمہ کی شاگرد رہی ہے جبکہ فاطمہ حسینی علم گرنر کالج میں بحیثیت استاد کام کر رہی تھی۔ میرے کہنے پر فاطمہ "مصل خواتین" سے وابستہ ہو گئیں۔ مصل خواتین کی پہلی غزلوں کی رات، میں ممتاز گلوکار امیر محمد خاں نے فاطمہ کی غزل پر اثر آواز میں سنا کر ایک سماں باندھ دیا تھا۔ وہ یادگار غزلوں کی رات، ہر اعتبار سے ناقابل فراموش ہے۔ ایم۔ اے کرنے کے بعد فاطمہ "حکمت تعلیمات" میں بہ حیثیت ٹیچر ملازم ہو گئی۔ اُس کی تعیناتی عالیہ اسکول میں ہوئی۔ کچھ عرصہ کے بعد حسینی علم گرنر کالج پر اس کا تبادلہ ہو گیا، وہاں سے کچھ چھپنے بعد علی آباد (انجن باؤلی) کے ایک اسکول پر اس کی پوسٹنگ ہوئی۔ وہ پریشان ہو گئی۔ مجھے فون کیا۔ اُن دنوں مرزا سرفراز علی صاحب ڈی۔ ای۔ او، تھے جو مجھے شاعری حقیقت سے بہت پسند کرتے تھے۔ میں نے دوسرے دن سرفراز صاحب کو تبادلہ کی منسوخی کے لئے فون کیا، معلوم ہوا کہ وہ پنچ کے لئے گھر گئے ہوئے ہیں۔ میں نے گھر پر فون کیا، وہ دوران پنچ فون پر آئے، اُن سے تبادلہ کی منسوخی سے متعلق بات ہوئی۔ سرفراز صاحب نے کہا کہ آج شام ۴ بجے کسی کو آفس بھجو کر آرڈر منڈیا لیجئے۔ یہ سن کر میری خوشی کی انتہا نہ رہی۔ اُس وقت ڈی۔ ای۔ او آفس

کاجی گورہ میں واقع تھا۔ میں خود آفس پہنچا۔ متعلقہ منتظم نے کہا کہ ڈی۔ای او صاحب انپیکشن کے لئے گئے ہوئے ہیں اور مجھ سے کہا ہے کہ یہ آرڈر آپ کے محلے کردوں۔ آرڈر کی ایک زائد کاپی لیتے کے بعد میں نے فاطمہ کو گھر پر فون کیا۔ خوش خبری سنائی۔ جب میں اس کے گھر پہنچا تو میز پر مٹھائی کا ڈبہ موجود تھا۔ میرے اس کارنامے سے فاطمہ کے دل میں میری عزت اور بڑھ گئی۔ بھائی بہن کا رشتہ اور مضبوط ہو گیا۔

میں نے اپنے مجموعہ کلام ”گل تازہ“ کی اشاعت کے موقع پر فاطمہ سے کتاب کے نام کے بارے میں مشورہ لیا تو کہا ”گل تازہ“ رکھ دیجئے۔ اچھا نام ہے، مہکتا ہوا سا۔ اور میں نے ”گل تازہ“ نام رکھ دیا۔ فاطمہ نسرین نے اپنی تمام غزلوں پر مجھ سے اصلاح لی ہے اور میں نے اس کی بہت سی غزلیں ماہنامہ ”خاتونِ دکن“ میں شائع کی ہیں۔

فاطمہ اس قدر نفیس، سیدھی سادی، پُر وقار شخصیت کی مالک ہے کہ اس نے کبھی اپنے رکھ رکھاؤ اور اپنی شخصیت کو مجروح ہونے نہیں دیا۔ اس نے ہمیشہ مشرقی ادب اور مشرقی تہذیب کی پاسداری کی ہے۔ نہایت مہذب، شائستہ اور پُر وقار لہجے میں گفتگو کرتی ہے، باوقار ہر سعید نے فاطمہ کو جب غزلوں کی رات کے موقع پر دیکھا، تو مجھ سے کہا تھا کہ اس لڑکی میں تو مغنیہ حسن ہے۔ پھر کچھ ایسا ہوا کہ میں اپنی اہلیہ کے ساتھ کبھی کبھی فاطمہ کے گھر جاتا، گھریلو مراسم اور بڑھنے لگے۔ فاطمہ کی والدہ مجھ سے بے حد متاثر ہیں، وہ مجھے اپنا تیسرا بیٹا سمجھتی ہیں۔ اُن کو اندازہ ہے کہ میں فاطمہ کا بہت خیال

رکھتا ہوں۔

اُن دنوں جب فاطمہ کے رشتے کی بات چلی رہی تھی۔ ایک دن فاطمہ نے مجھے بلوایا اور اپنے رشتے کے بارے میں میری رائے مانگی۔ میں نے کہا، 'جب تمہاری والدہ، بھائی، افرادِ خاندان اس رشتہ کو تمہارے لئے مناسب سمجھتے ہیں تو تم اس رشتہ کو قبول کر لو اور جہاں تک تم نے مجھے تفصیل بتلائی ہے میرے خیال میں تمہارے لئے یہ رشتہ موزوں رہے گا۔ تم ہاں کہہ دو۔ فاطمہ کی شادی ہوگئی اور وہ ایک سال کے بعد اپنے شوہر کے ہاں شکاگو (امریکہ) چلی گئی۔ فاطمہ کی شادی کے اہتمام میں دوسرے بھائیوں کی طرح بیوری دلیپسی اور خلوص کے ساتھ میں نے بھی حصہ لیا۔ شادی سے پہلے بعض فیصلے میرے گھر (گھانسی بازار) میں ہوئے۔ دیگر رشتہ داروں کے مقابلے میں شادی کی تقریب میں، میں ہی انیٹوش پیشکش رہا۔ اور ایک بہن کو خدا حافظ کہنے والے بھائیوں کے ساتھ میں بھی خاموش بادیدہ تم کھڑا رہا۔

فاطمہ گزشتہ ۱۷، ۱۸ سال سے امریکہ میں ہے، دو تین سال میں ایک دفعہ حیدرآباد آتی ہے اور اپنی والدہ بچھا ٹھہرتی ہے اور جب تک حیدرآباد میں رہتی ہے میں اُس سے ملتا رہتا ہوں۔ دو سال پہلے جب حیدرآباد آئی تھی تو اُن ہی دنوں میرے بڑے لڑکے شمس الدین عارف کی شادی ہوئی۔ فاطمہ نے اپنے بچوں کے ساتھ شرکت کی تھی اور عارف کو اس کی دو بہن کو ڈھیر ساری دعائیں دے کر واپس ہوئی۔ فاطمہ کے شوہر شکاگو میں ایک اچھی خدمت پر فائز ہیں۔ فاطمہ جب بھی حیدرآباد آتی ہے تو میرے لئے کوئی نہ کوئی تحفہ فرمواتی ہے۔

گزشتہ بار جب حیدر آباد آئی تو اپنے شوہر کے مشورہ سے مجھے ایک قیمتی تحفہ دیا تھا۔ فاطمہ ہنستے ہوئے آتی ہے اور روتی ہوئی جاتی ہے۔ میری زندگی کے بہت سے روشن لمحے فاطمہ کو روشن اور تابناک دیکھنے میں گذرتے رہے ہیں۔ اُس کی شادی کے موقع پر میں نے صرف ایک نظم تحفہ دی تھی۔ شادی کے کچھ دن بعد جب میں اپنی اہلیہ کے ساتھ فاطمہ سے ملنے کے لئے اس کے سسرال گیا تو اُس نے اپنے کمرہ میں ہم دونوں کو بلوایا اور مجھے وہ قریم کی ہوئی تہنیتی نظم دکھائی جو اس کے طہران نے کی دیوار پر آویزاں تھی۔

محبت چاہے کس رنگ و روپ میں ہو، وہ ایسا گہرا اثر چھوڑتی ہے۔ بسج تو یہ ہے کہ محبت کی ایک شکل ایسی بھی ہے جو تمام انسانی رشتوں سے اعلیٰ و ارفع ہے۔

اب کی بار فاطمہ تیسرین دو سال کے بعد امریکہ سے حیدر آباد آئی تھی۔ حسن اتفاق کہتے کہ اس بار بھی میرے تیسرے لڑکے منہاج الدین خسرو کی شادی میں فاطمہ نے شرکت کی۔ اس دفعہ اُس نے ایک اچھا کام یہ کیا کہ اپنا مجموعہ کلام ”بہاروں کی منزل“ شائع کیا۔ جب میں فاطمہ سے ملنے کے لئے اُنکی گھر گیا تو اُس نے کتاب کی اشاعت کی تجویز رکھی۔ فاطمہ نے مختلف اوقات میں کئی ہوئی تخلیقات جو منتر شکل میں تھیں، جمع کیا تھا۔ اس کتاب میں شامل بہت سی نظمیں اس نے اپنے قیام حیدر آباد کے دوران ہی ہیں۔

”بہاروں کی منزل“ میں دینی اور مذہبی شاعری کے علاوہ موضوعاتی کلام اور منتخب غزلیں بھی شامل ہیں۔ یہ کتاب تین ہفتوں کی مسلسل کدو کاوش کے بعد

تہایت دیدہ زیب و خوبصورت شکل میں منظر عام پر آگئی۔

”بہاروں کی منزل“ کی رسم اجراء تقریب ۱۹ اگست ۱۹۹۱ء کو ممتاز شاعرہ انجسم قمر سوز کی رہائش گاہ (انجمن قمر۔ لمے پلی) میں حیدر آباد کی معتبہ تعلیم یافتہ خواتین کی موجودگی میں ممتاز نقاد و ادیب محترمہ صالحہ الطاف میر خاتون دکن کے ہاتھوں انجام پائی۔ اردو، فارسی اور انگریزی کی نامور شاعرہ ڈاکٹر بانو طاہرہ سعید نے صدارت کی تھی، جبکہ مہمانانِ خصوصی کی حیثیت سے مشہور اہل قلم خواتین محترمہ فاطمہ علی خاں معتمد محفل خواتین، ڈاکٹر اختر سلطانہ، انجم قمر سوز، ڈاکٹر مبارہ سعید اور قمر جمالی نے فاطمہ نسreen کے فن اور شخصیت پر روشنی ڈالی۔ اظہارِ تشکر کے طور پر فاطمہ نسreen نے بھی مخاطب کیا۔ صالحہ الطاف اور بانو طاہرہ سعید نے بھی اپنے تاثرات پیش کئے۔ ممتاز افسانہ نگار و ادیب محترمہ انیس قیوم فیاض نے نہایت عمدگی سے جلسے کی کارروائی چلائی۔ مولیٰ اجلاس کے بعد مشاعرہ ہوا جس میں صدر مشاعرہ ڈاکٹر بانو طاہرہ سعید کے علاوہ محترمہ انجم قمر سوز مظفر النساء ناز، قمر فاطمہ نسreen، ناز شہان، ریشم، سنیہ، عکرمہ، سنا کر دادو تحیسن حاصل کی۔ محترمہ مظفر النساء ناز شریک معتمد محفل خواتین نے سلیقہ کے ساتھ معتمدہ مشاعرہ کے فرائض انجام دیئے۔ اس تقریب میں صرف خواتین شریک تھیں۔ تقریب سے متعلق تمام انتظامات راقم الحروف کی نگرانی میں سرانجام پائے۔ انجسم قمر سوز نے مجھ سے مکمل تعاون کیا، اور اپنی جانب سے اس تقریب کا ریڈیو کیسٹ مہمان شاعرہ فاطمہ نسreen کی خدمت میں پیش کیا۔ رسم اجراء تقریب کی خبر روزنامہ سیاست میں تین کالم کی سرخی کے ساتھ شائع ہوئی۔

ادبی حلقوں میں 'بہاروں کی منزل' کی اچھی خاصی پذیرائی ہوئی۔ فاطمہ نسرین نے مخاطب کرتے ہوئے یہ بھی کہا تھا کہ :-

* حیدرآباد میں مختصر قیام کے دوران میں بے حد مصروف رہی۔ بچوں کی اور میری صحت کی ناسازی کا سلسلہ بھی چلتا رہا۔ باقی وقت ملاقاتوں اور دعوتوں کی نذر ہو گیا۔ کتاب کی اشاعت پر تو بھر اس وقت کی جبکہ امریکہ کو واپسی کا وقت قریب آگیا۔ میں نے نسیۂ بھائی (صلاح الدین نسیۂ) سے اس کا ذکر کیا۔ ابشدا وہی سے میں نے اپنے بھائیوں میں انہیں بھی حقیقی بھائی ہی کی طرح سمجھا۔ ان کے اعلیٰ کردار اور ان کے جذبہ ہمدردی سے میں بہت متاثر ہوں۔ ان کی مقناطیس جیسی شخصیت نے میرے کاغذات کے ایک ایک پُرزہ کو سمیٹ کر یکجا کیا اور بہت کم وقت میں بہت گہری دلچسپی اور محنت سے، کلام کی تصحیح سے لیکر کتاب کی اشاعت تک سارے مراحل طے کئے۔ اس کرم فرمائی کے لئے میرے پاس شکریہ کے لئے الفاظ نہیں ہیں۔ ہاں میری دعائیں ہیں جو ان کے ساتھ ہمیشہ رہیں گی۔ "



انجمن قمر سوز

کچھ نام ایسے بھی ہوتے ہیں جو اپنی معنویت کی وجہ سے سُسنے والوں کو تجسس میں مبتلا کر دیتے ہیں۔ انجمن قمر سوز بھی ایک ایسا ہی نام ہے۔ اس نام کے پیچھے ایک ایسی شخصیت کا وجود جلوہ فرما ہے جو اپنی ہمہ جہتی خصوصیات کی وجہ سے نہ صرف اپنے خاندان بلکہ رشتہ داروں اور دوستوں میں بھی پسند کی جاتی ہے۔

جب میں نے پہلی دفعہ یہ نام سُنا تو مجھے یوں محسوس ہوا کہ شاید اس نام کے پیچھے کوئی غیر معمولی شخصیت ہوگی۔ انجمن آیا مجھ سے عمر میں چھوٹی ہیں لیکن پتہ نہیں کیوں میں نے انجمن قمر سوز کے بجائے انجمن آیا کہنے کو ترجیح دی (شاید اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ میں اُن کا احترام بھی کرتا ہوں)۔ کچھ شخصیتیں ایسی ہوتی ہیں کہ اُن سے پہلی ملاقات کے بعد ہی کسی نہ کسی رشتہ سے منسوب ہونے کو خود بخود جی چاہتا ہے۔

جب میں اپنے وطن تعلقہ ہتھاباد ضلع بیدر سے ڈل اسکول کی تعلیم کے بعد اعلیٰ تعلیم کے لئے حیدرآباد آیا تو میں اپنی حقیقی بہن کے پاس

بیسویں الاوہ (گھانسی بازار) میں رہا کرتا تھا۔ میں اس محلہ میں کئی برس رہا۔ ڈاکٹر قمر الدین تیرے ڈاکٹر ہوئے تھے جو میرے ہم محلہ تھے۔ میری بڑی لڑکی طلعت سلطانہ کی طبیعت ناسازہ ہونے کی وجہ سے ایک دن میں ڈاکٹر قمر کے ہاں گئی۔ ڈاکٹر قمر الدین مجھے ایک شاعر کی حیثیت سے جانتے تھے (یہ بات انھوں نے مجھے بعد میں بتائی)۔ جب میں اُن کے کلینک پہنچا تو وہ مجھ سے بہت خلوص سے ملے، بچی کو دیکھا اور دوائیں دیں۔ جب میں فیس دے رہا تھا تو ڈاکٹر قمر الدین نے اپنی بھرپور مسکراہٹ کے ساتھ کہا کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ آپ نے مجھ اس قابل سمجھا کہ میں آپ کی خدمت کے لیے یہی میرے لیے کافی ہے۔ ڈاکٹر قمر الدین نے میری یہ سلی ملاقات تھی۔ ابھی انجسم آپا سے میرا تعارف نہیں ہوا تھا، البتہ مجھے معلوم تھا کہ میاں بیوی دونوں شاعریں۔ اُن دنوں میں ”بزمِ جیون“ کے مشاعروں میں بھی شریک ہوا کرتا تھا۔ ایک مشاعرہ میں، میں نے انجسم قمر سوز کو پیر کے کے پیچھے سے پُر سوز ترنم ترنم کلام سُناتے ہوئے سنا۔ اُس نئی شاعرہ کا کلام اور ترنم مجھے پسند آیا۔ کچھ دن گزر گئے۔ پھر یوں ہوا کہ ایک دن میرے ایک شاعر دوست زاہد کمال کے بڑے بھائی مرزا صاحب نے جو آل انڈیا ریڈیو حیدرآباد میں کسی شعبہ کے منتظم تھے، مجھ سے اپنے گھر کی مخصوص محفلِ شعر میں شرکت کرنے کی خواہش کی۔ اُن کا گھر ڈاکٹر قمر الدین کے مکان کے روبرو تھا۔ اُس محفل میں بھی انجسم قمر سوز نے چلمن کے پیچھے سے کلام سُنایا تھا، ڈاکٹر قمر الدین نے ہلکے ہلکے پُر سوز ترنم میں غزل سُنائی تھی

کچھ دن اور گزر گئے۔ سنگاریڈی (ضلع میدک) میں ایک مشاعرہ تھا۔
 سعد حسین سعد آئی۔ اے۔ ایس، وہاں ڈپٹی کلکٹر تھے۔ اُن کے زمانے
 میں وہاں اکثر مشاعرے ہوا کرتے تھے۔ ڈاکٹر قمر الدین کی پوسٹنگ بھی
 سنگاریڈی پر ہوئی تھی۔ مشاعرہ کے بعد ڈاکٹر قمر الدین نے اپنے گھر پر شاعروں
 کو چائے پر بلایا تھا۔ ڈاکٹر قمر الدین سے یہ میری دوسری ملاقات تھی۔ سنگاریڈی
 کے اُس مشاعرہ میں یکدم قریشی سے بھی ملاقات ہوئی تھی۔
 اُن دنوں عزیز قریشی پروگرام انگریڈیو، خاتون شعراء کا
 ایک مشاعرہ کرنا چاہتے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ میں نہ صرف رسالہ خاتونِ دکن،
 سے وابستہ ہوں بلکہ روزنامہ سیاست کے شعبہ شعر و سخن سے بھی تعلق رکھتا
 ہوں، اس لئے انہیں یقین تھا کہ میں شاعرات کو آل انڈیا ریڈیو کے مشاعرہ میں
 مدعو کرنے کے سلسلہ میں اُن سے بھرپور تعاون کروں گا۔ ایک دن انہوں نے مجھ
 سے خواہش کی کہ میں شاعرات کو مدعو کرنے کے سلسلے میں اُن سے تعاون کروں۔
 میں نے یہ ذمہ داری قبول کی۔ اُس مشاعرہ کے لئے تقریباً ۱۵ شاعرات کو مدعو کیا گیا
 تھا۔ میں نے نئی شاعرات میں انجم قمر سوز کا نام بھی تجویز کیا۔ اس سلسلے میں ایک
 عمدہ خط ڈاکٹر قمر الدین کو لکھا۔ یہ شاندار یادگار مشاعرہ آل انڈیا ریڈیو کے
 احاطہ میں مدعو سامعین کی موجودگی میں ہوا تھا۔ مشاعرے کی اس محفل میں شہر
 کے ممتاز شاعروں، ادیبوں، دانشوروں اور باذوق خواتین و حضرات کی کثیر
 تعداد نے شرکت کی تھی۔ گرما کا موسم تھا، فضا میں خوشگوار ماحول کی
 بھینی بھینی خوشبو پھیل گئی تھی۔ سارا ماحول معطر تھا۔ مشاعرہ سننے والے

اس قدر شائستہ تھے کہ محسوس ہو رہا تھا کہ سب کے سب ایک ہی خاندان کے لوگ ہیں۔ آدابِ محفل، اندازِ گفتگو، ملاقات کے طور طریق، سارے ماحول میں شگفتگی کا احساس دل رہے تھے۔ میں اپنے شاعر دوستوں کے ساتھ پہلی صف میں بیٹھا ہوا تھا۔ خواتین کی نشستوں کے لئے مشاعرہ گاہ کے دائیں جانب علیحدہ انتظام تھا۔ مشاعرہ کے آغاز سے قبل کسی نے مجھ سے کہا کہ شعبہ خواتین سے کوئی محترمہ آپ سے ملنا چاہتی ہیں۔ میں اُن صاحب کے ہمراہ چلا گیا۔ جیسے ہی میں خواتین کے سکشن کے قریب پہنچا تو ایک اجنبی مگر جانی پہچانی آواز نے مجھے مخاطب کیا اور اپنا تعارف کراتے ہوئے کہا کہ میں انجم قمر سوز ہوں۔ ویسے میں نے بھی دیکھتے ہی اندازہ لگا لیا تھا کہ یہ انجم قمر سوز ہی ہیں۔ میں نے انجم قمر سوز کو اس مشاعرہ میں پہلی دفعہ دیکھا۔ اس مختصر تعارف کے بعد میں اپنی صف میں چلا گیا، پھر میں نے نشست سنبھال لی۔ کچھ دیر بعد مشاعرہ شروع ہوا۔ انجم قمر سوز نے پُر سوز ترنم میں ایک خوبصورت غزل سنائی۔ سامعین نے داد و تحسین سے نوازا۔ انجم قمر سوز کا یہ پہلا مشاعرہ تھا جس میں انہوں نے پردہ سے باہر آکر کلام سنایا تھا۔ مشرقی تہذیب سے آراستہ اس شاعرہ نے اپنے پُر سوز کلام سے ساری محفل کو متاثر کیا تھا۔ اس مشاعرہ کے بعد سے انجم قمر سوز سے ملاقاتوں کا سلسلہ جاری ہوا۔

محفل خواتین کی پہلی غزلوں کی رات کی تیاریاں شروع ہو چکی تھیں۔ میں نے صدرِ محفل خواتین عظمت عبدالقیوم سے انجم قمر سوز کا تعارف کروایا۔ انجم قمر سوز محفل خواتین کی رکن بن گئیں۔ عظمت نے ایسا نے میرے

مستورہ سے انہیں غزلوں کی رات، کانٹوینر نامزد کیا۔ غزلوں کی رات کے پروگرام کے سلسلے میں مجھے انجمن قمر سوز سے بار بار ملنے کا اتفاق ہوتا رہا۔ وہ اُن دنوں اپنی بھوپنی کے ہاں آغا پورہ میں رہتی تھیں۔ (سنگاریڈی بھی جیسا کرتی تھیں)۔ عظمت عبدالقیوم کی مشاورت سے ہم غزلوں اور گلوکاروں کا انتخاب کیا کرتے تھے۔

پہلی غزلوں کی رات ۱۹۷۲ء کو نائش کلب میں منعقد ہوئی تھی جس میں شہر کی ممتاز شخصیتوں کے علاوہ اہل ذوق اصحاب نے شرکت کی تھی۔ اُس غزلوں کی رات کے بارے میں اُس وقت کے شہ کاٹے محفل کا خیال ہے کہ اُس محفل موسیقی کا تاثر آج بھی برقرار ہے۔ اُن کی رات بے حد کامیاب رہی۔ اس کامیاب محفل موسیقی کے بعد بھی انجمن قمر سوز سے ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ کبھی مشاعروں کے سلسلے میں تو کبھی مجموعہ کلام کی اشاعت کے بارے میں۔ یہ ملاقاتیں جب زیادہ بڑھنے لگیں تو ہم دونوں تکلفات کے دائرہ سے باہر نکل کر بھائی بہن کے یا کیسزہ رشتہ سے منسلک ہو گئے۔ یہ رشتہ اب بھی اسی تازگی، تسکینگی اور جذباتی ہم آہنگی کے ساتھ برقرار ہے۔

انجمن آیا ایک پارہ صفت شخصیت کی مالک ہیں۔ اُن کی مسکراہٹ سے زیادہ مجھے اُن کا تہمتہ پسند ہے۔ میں اکثر اُن سے خفا رہا کرتا تھا، پھر غرور ہی اپنے طور پر اُن کے گھر جاتا۔ انجمن آپا نے ہمیشہ خلوص دل سے میرا استقبال کیا۔ شعری مجموعہ سوز قمر، میرے مسلسل اصرار پر شائع ہوا۔ کتب کی اشاعت کا سارا کام میں نے خود اپنے ذمہ لیا تھا۔ جناب فصیح الدین ریٹائرڈ

سشن نچ (والد محترم انجم قمر سوز) کی رہائش گاہ واقع سالہ جنگ کالونی میں سابق گورنر ہمارا شہر جناب صادق علی نے ”سوز قمر“ کی رسم اجراء انجام دی تھی جس میں مخصوص شاعروں اور ادیبوں نے شرکت کی تھی۔ انجم آپا کے مزاج میں پہلی ملاقات کے وقت جو گفتگو تھی، آج بھی برقرار ہے۔ آج بھی سرسبز و شاداب پھولوں کی طرح اپنے اہل خاندان، رشتہ داروں اور دوستوں میں اپنے غلوں کی خوشبو یا نئی رہتی ہیں۔ انجم قمر سوز کی شائستہ طبیعت، شرافت نفس، مزاج کی نرمی اور روابط کی پائیداری نے مجھے ہمیشہ متاثر کیا۔ میں اُن کے رکھ رکھاؤ، انداز گفتگو اور لب و لہجہ کے تیکھے پن کے علاوہ اُن کی شعری، ادبی و تہذیبی صلاحیتوں اور سلجھے ہوئے انداز فکر کا قائل ہوں۔ انجم قمر سوز ایک خوشحال گھرانے کی چشم و چراغ ہیں، جن کا سارا گھرانہ شعروں و فنم کے ماحول سے سرشار رہا کرتا ہے۔ اُن کی والدہ کو موسیقی سے بے حد لگاؤ ہے خاص طور پر کلاسیکی گائیکی اُن کی فطرت کا خاصہ ہے۔ اُن کے والد محترم مولوی فیض الدین خالص حیدر آبادی رنگ کے ایک باوقار شخصیت کے مالک ہیں۔ انجم قمر سوز کے بھائی نسیم احمد اپنے دور کے ایک نمایاں طالب علم رہے ہیں۔ ان کی بہنوں میں خاص طور پر رضیہ حبیب علی، ادبی ذوق رکھتی ہیں۔ حسن اتفاق سے انجم قمر سوز اور میں ایک ہی محلے پٹی میں رہتے ہیں۔ اتنی قربت کے باوجود زیادہ تر فون یا برہی گفتگو رہتی ہے۔ فون پر گفتگو سے ایسا بھی محسوس ہوتا ہے کہ فاصلے کس قدر گھٹ گئے ہیں۔



انیس، قیوم فیض

”خاتونِ دکن“ سے وابستگی کے بعد حیدرآباد کے بعض نئے لکھنے والوں کی تحریریں رفتہ رفتہ مجھے متاثر کرنے لگیں جن میں طالبات بھی تھیں، طالب علم بھی اور بعض اردو کے اساتذہ بھی۔ ان کے علاوہ معروف اہل قلم وِ وِخواتین کی تخلیقات سے بھی میں متاثر ہوا۔ اس دور میں مرد اہل قلم اصحاب کے ساتھ کچھ خاتون افسانہ نگاروں، ادیبوں اور شاعرات سے بھی ادبی خطوط کا سلسلہ جاری رہا۔ رشتوں کی پاکیزگی اور شائستہ روابط نے بھی احسان دلانا شروع کیا۔

”خاتونِ دکن“ کے سلسلہ کا شائستہ اور پاکیزہ رشتوں کا ایک بہترین تحفہ انیس قیوم بھی ہے۔ مجھے اُن دنوں جتنی تحریروں سے سالانہ پڑا اُن میں سب سے زیادہ موثر صرف انیس قیوم کی تحریر ہوتی تھی۔ انیس کے خطوط موتیوں میں دھن دھن نکلتے تھے۔ میری تمام بہنوں میں انیس پہلی بہن ہے جس نے مجھے سب سے زیادہ خطوط لکھے ہیں اور ہر خط میں کبھی نہ ختم ہونے والی بھائی بہن کی محبت کی خوشبو رہتی تھی۔ ایسی میں سکونت کے زمانے میں بھی انیس مجھے پابند سے خطوط لکھا کرتی تھی۔ انیس قیوم اُس وقت ایک افسانہ نگار کی حیثیت

سے مشہور ہو چکی تھیں۔ جب وہ بی۔ ایس سی کی طالبہ تھیں تو ان دنوں زیادہ تر افسانے بانو اور بیسویں صدی میں شائع ہوتے تھے۔ جب خاتونِ دکن، ادبی حلقوں میں مقبول ہوتے لگا تو مجھے حیدرآباد کے بہت سے اہل قلم خواتین و حضرات کا تعاون حاصل ہونے لگا۔ "خاتونِ دکن" کے لئے شاعروں اور ادیبوں سے خط و کتابت میں ہی کیا کرتا تھا۔ انیس کو میں نے ہمیشہ بہترین مشورہ دیا۔ ایک دن راکھی پونم کے موقع پر مجھے پوسٹ کے ذریعہ ایک راکھی ملی۔ اس راکھی میں کچھ ایسی پکیزگی اور کشش تھی کہ مجھے ایک دن انیس کے گھر جانا پڑا۔ انیس کے گھر والوں نے میرا غیر مقدم کیا۔ غالباً انیس نے پہلے ہی اپنے گھر والوں (والدین) سے میلا غائبانہ تعارف کرایا تھا۔ ادبی ہم آہنگی کے ساتھ ہماری طبعی ترجمہ نے کچھ ایسا رنگ اختیار کیا کہ ہم بھائی بہن کے پاکیزہ رشتہ میں بندھ گئے۔ انیس نے بی۔ ایس سی اور بی۔ ایڈ کرنے کے بعد ایوننگ کالج (جامعہ عثمانیہ) سے ایم اے اردو امتیاز کے ساتھ کامیاب کیا۔ تعلیمی امور میں وہ مجھ سے مشورہ کیا کرتی تھی۔ میں نے نیشنل ہائی اسکول (چھتہ بازار) میں ٹیچر کی حیثیت سے ملازمت دلوائی۔ انیس نے اس اسکول میں تقریباً ۴ سال تک کام کیا۔ اس اثنا میں اس کی شادی ہو گئی۔ انیس کے شوہر قیاض اقبال اس وقت ایر فورس میں انجینئر تھے۔ وہ ایک سنجیدہ، کم گو، سلیکھ ہوئے عمدہ انسان ہیں۔ ان دنوں وہ کلف ایر، ابوظہبی میں انجینئر ہیں۔ ان دنوں کی اردو ادبی زندگی بے حد کامیاب ہے۔ شادی کے بعد انیس اور اقبال میرے گھر آئے اور میری اہلیہ اور بچوں سے مل کر بہت خوش ہوئے۔

میں نے انیس کے افسانوں کا مجموعہ ”گھر کا دیوار“ اپنی نگرانی میں شائع کیا۔ دوسری کتاب ”حیدر آباد میں اردو افسانہ نگاری“ میں بھی میرا تعاون رہا۔ اس کتاب کی اشاعت کے لئے محکمہ تعلیمات کے علاوہ ادبی ٹرسٹ اور نظامس اردو ٹرسٹ نے رقمی امداد دی تھی۔ ”حیدر آباد میں اردو افسانہ نگاری“ انیس قیوم کے ایم۔ اے کا ڈسسرٹیشن تھا۔ ”خاتونِ دکن“ میں انیس کے پہلے سے افسانے شائع ہو چکے ہیں۔

انیس مجھے ہر سال پابندی سے راکھی باندھتی رہی۔ اپنے شوہر کے ساتھ ساٹ برس تک لیسیا میں رہنے کے بعد گزشتہ تین سال سے حیدر آباد میں ہے۔ وہ جب بھی حیدر آباد آتی، مجھ سے ملنے کے لئے اپنے شوہر کے ہمراہ دفتر سیاست آجاتی، پھر دونوں میرے گھر آجاتے۔ یہ اُن کا ایک طریقہ تھا۔ انیس ان دنوں شاداں اسکول میں درس دیا کرتی ہے۔ انیس کا لڑکا فراز، شاداں کا لچ آف انٹرمیڈیٹ میں زیر تعلیم ہے اور بیٹی فرحزنا، میٹرک کا امتحان دے رہی ہے۔ ماں باپ کی طرح یہ دونوں بھائی بہن نہایت خوبصورت اور صحت مند ہیں۔ میرے گھر کے لوگ انیس کا بہت خیال رکھتے ہیں۔ انیس نے میرے بڑے لڑکے شمس الدین عارف کی شادی کے انتظامات میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا۔ انیس اس طرح میرے گھر آتی ہے جیسے ایک حقیقی بہن، اپنے پورے حقوق، اور اعزازات کے ساتھ اپنے بھائی کے ہاں آتی ہے۔ انیس ہے بھی اس قابل کہ اس کا خیال رکھا جائے۔

زندگی کچھ اس قدر مسرت بخشی ہے کہ اب انیس سے مہینوں ملاقات

نہیں ہوتی، لیکن فون پر غیر وحاقیت کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ جب ایس
 اپنی شادی کے بعد پہلی دفعہ اپنے شوہر کے ساتھ میرے گھر آئی تو اس نے
 اپنے کان کی خوبصورت سونے کی بلیاں میری چھوٹی لڑکی زینت نسرین
 کے کانوں میں پہنا دی۔ زینت نسرین اپنی چھوٹی بچے اس پر غلوص تحفہ
 کو تمام تحفوں میں سب سے اہم تحفہ سمجھ کر خوشی محسوس کرتی ہے۔

• •



منظر النساء ناز

احاطہ سکریٹریٹ میں محکمہ قانون سے وابستہ ایک برقعہ پوش لڑکی پر جب پہلی دفعہ میری نظر پڑی تو میں ایک لمحہ کے لئے رک گیا۔ اس کے ہمراہ محکمہ تعلیمات سے وابستہ ایک لڑکی شمشیر بھی تھی۔ یہ دونوں جی۔اے۔ ڈی اور محکمہ تعلیمات کے موٹر پر محو گفتگو تھیں۔

ان دونوں سکریٹریٹ اردو اسوسی ایشن کی سرگرمیاں عروج پر تھیں۔ آل انڈیا ریڈیو اور دیگر ادبی و شعری پروگرامس کے سلسلے میں مجھے سکریٹریٹ میں کام کرنے والے باصلاحیت فنکاروں، شاعروں اور ادیبوں کی تلاش تھی۔

سکریٹریٹ میں بہت سی ادب دوست لڑکیاں کام کرتی تھیں۔ یاد نہیں کہ

منظر النساء ناز سے میرا تعارف کہاں اور کس جگہ ہوا تھا، البتہ اتنا یاد ہے کہ محکمہ قانون سے وابستہ ایک آندھرائی ڈرامہ آرٹسٹ عبدالغفور نے

تعارف کرایا تھا۔ منظر النساء ناز سے تعارف کے بعد میں نے ان سے سکریٹریٹ

اردو اسوسی ایشن کی سرگرمیوں میں شامل ہونے کی خواہش کی۔ منظر النساء ناز

سکریٹریٹ کی دیگر لڑکیوں کے ساتھ شریک انجمن ہو گئیں۔ میں نے منظر النساء ناز

کو شعبہ خواتین کا اچھا راج بنایا۔ سکریٹریٹ کی جن لڑکیوں نے اردو اسوسی ایشن

سے وابستگی اختیار کی اور پروگرامس میں حصہ لیتا شروع کیا، اُن میں سے مظفر کے علاوہ شمسہ، محسنہ، شیریں، قابل ذکر ہیں۔

مظفر النساء ناز کو شاعری کا بے حد شوق تھا، وہ اُن دنوں افسانے بھی لکھا کرتی تھی۔ مظفر النساء ناز بیک وقت میری شاگرد بھی بن گئی اور بہن بھی۔ میں نے سکریٹریٹ اُردو اسوسی ایشن کے مشاعروں کے علاوہ شہر کے بعض اچھے اور ثقہ قسم کے مشاعروں میں کلام سنانے کی ترغیب دی۔ جب محفلِ خواتین کا قیام مل میں آیا تو وہ محفلِ خواتین سے وابستہ ہو گئیں۔ مظفر النساء ناز کے شوہر نذر اللہین نیاز بھی شعر کہتے ہیں، لیکن وہ مشاعروں میں کلام نہیں سنا تے۔ مظفر کے ادبی ذوق کی تربیت میں نیاز صاحب کا بھرپور تعاون شامل ہے۔ شعر و ادب کی وساطت سے ہمارے روابط بڑھنے لگے۔ مظفر بلا تکلف میرے گھر آیا کرتی۔ میرے اہل خاندان، مظفر کی فراخ دلی کے ساتھ پذیرائی کیا کرتے۔ جب تک مظفر النساء ناز سکریٹریٹ میں رہی، اسوسی ایشن کی سرگرمیوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتی رہی۔ جب اس کا تقرر الیکٹریسیٹی بورڈ (ویدت سودھا) میں ہوا تو اُس نے وہاں کی بزمِ اُردو کی سرگرمیوں میں دلچسپی یعنی شروع کی۔ بزمِ اُردو کے زیر اہتمام بہت سے اچھے اچھے مشاعروں کے انعقاد میں تعاون کیا۔ مظفر النساء ناز کا پہلا مجموعہ کلام "بات پھولوں کی" میری نگرانی میں شائع ہو چکا ہے۔ رسمِ اجراء کی تقریب اعلیٰ پیمانے پر مولانا ابوالکلام آزاد ریسرچ انسٹی ٹیوٹ میں منعقد ہوئی تھی۔ مظفر النساء ناز کے شعری ذوق کو محسوس کرتے ہوئے میں نے صدرِ محفلِ خاتین عفتت عبدالقیوم سے خواہش کی تھی کہ مظفر النساء ناز

کو محفلِ نواتین کا رکن بنائیں۔ عظمتِ عبدالقیوم نے نہ صرف رکن ہی بنا یا بلکہ شریکِ معتمد و خازن کی ذمہ داری بھی سونپ دی۔ مظفر ایک اچھی شاعرہ ہی نہیں ایک اچھی آرگنائزر بھی ہے۔ محفلِ خواتین کے لئے مظفر کی خدمات ناقابلِ فراموش ہیں۔ مظفر النساء ناز کی حیدرآباد کی شاعرات میں اپنے مزاج کی شائستگی، طبیعت کی پاکیزگی، سلیقہ شعاری اور وضع داری کی وجہ سے اپنا ایک خاص مقام رکھتی ہے۔ مظفر نے شہر کے مشاعروں کے علاوہ اضلاع کے بعض خاص خاص مشاعرے بھی پڑھے ہیں۔ محفلِ خواتین کی سرگرمیوں کے سلسلے میں ہم عظمتِ عبدالقیوم کی رہائش گاہ ”خیابان“ امیر پیٹ میں اکٹرا کرتے تھے۔ عظمتِ عبدالقیوم، مظفر کو بہت چاہتی تھیں، محفلِ خواتین کی سرگرمیوں میں اُس پر بھروسہ کرتی تھیں۔ عظمتِ عبدالقیوم کے تفویض کردہ ہر کام کو وہ سلیقہ سے انجام دیا کرتی تھیں۔ وہ آج بھی محفلِ خواتین کی شریکِ معتمد اور خازن ہے اور پُر اعتماد فضاء میں کام کر رہی ہے۔ مظفر النساء ناز مشرقی ماحول کی ایک ایسی ہندو خاتون ہے جس کی سادگی اور بھولا پن قابلِ رشک ہے۔ خاموشی، کم سخن، بردباری اور بزرگوں کا احترام اس کی طبیعت کا خاصہ ہے۔ مظفر سُستی زیادہ ہے اور بولتی کہہ ہے، وہ مجھ سے ہمیشہ نرم لہجے میں گفتگو کرتی ہے۔ ایک سعادت مند، محبت شناس اور سچے دل سے پیار کرنے والی بہن ہیں۔ مظفر النساء ناز کا بھی اہم مقام ہے۔ کبھی کبھی میں کسی بات پر ناراض ہو جاتی ہوں تو مظفر سہم جاتی ہے، خفا ہو جاتا ہوں تو رنجیدہ ہو جاتی ہے۔ کبھی کبھی لبر میں آجاتی ہے تو کُسن کر گفتگو کرتی ہے۔ کبھی میرے ساتھ

ممتاز شعراء رئیس اختر اور فیض الحسن خیال کو دیکھتی ہے تو کہتی ہے، یہ دونوں آپ کے "بازوبند" ہیں۔ ہم تینوں کی مستالی دوستی پر وہ خوش ہوتی ہے۔

اگر انسانی رشتوں کی بنیاد بے لوث خلوص، پاکیزہ جذبات اور شرافت نفس کی آئینہ دار ہو تو ایسے رشتے کبھی نہیں ٹوٹتے بلکہ جیسے جیسے دن گزرتے جاتے ہیں، اُن رشتوں کی تازگی اور تسکنتگی میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ یہ بھی سچ ہے کہ مظفر، شبیم سے دُھلے ہوئے لمحوں کی پہچان ہے۔

==



شفیع قادری

میری تمام بہنوں کی محبت اپنی جگہ مسئلہ سہی لیکن شفیع قادری نے صالحہ الطاف کی طرح میری زندگی کے تمام روشن پہلوؤں کو سورج کی کرنوں سے جالا لیا ہے۔

میری شاعرانہ زندگی کو فقوہ نظر سے روشناس کرانے کے علاوہ میرے فکر و خیال کو ہمیز کیا ہے۔ ایک ذہین و فطین مبصر کی طرح میری شخصیت اور فن کے مختلف گوشوں کو اجاگر کرتے ہوئے مجھ کو اپنی پہچان کا احساس دلایا ہے اور میرے شعری سفر کی خوشگوار اور مشکل پسند راہوں کی نشان دہی کی ہے۔ اس کے باوجود شفیع کا یہہ احساس ہے کہ میرا شعری سفر اس وقت تک نامکمل رہے گا جب تک کہ میں احساسات اور جذبات کی مختلف پگھلیداریوں سے گھبراتے ہوئے حیرت کی منزل تک نہ پہنچوں۔

شفیع، دل و جان سے چاہتے والی بے لوث جذبات سے معمور میری بہن ہیں۔ میری ایک لمبی طاقت بھی ہے جو مجھے باحوصلہ جیتے کا فن بھی سکھاتی ہے وہ ایک باخبر رہبر کی طرح میری شخصی، سماجی اور شاعرانہ زندگی کو ایک ایسی منزل پر دھکچکا جاتی ہے، جہاں تک پہنچنے کی لوگ آرزو کرتے ہیں۔ وہ میری سچی اور پُر غلوں ہمدرد ہیں، بلکہ ایک ایسی شخصیت کی مالک بھی ہے جو دنیا کو ہمیشہ اپنی نظر سے دیکھنے کی تلقین کرتی ہے۔ وہ روشنی کی تلاش کے لئے سب سے

پہلے اپنے وجود کو مرکز بناتی ہے۔ شفیقہ کا خیال ہے کہ انسان کے لئے پہلے اپنی شناخت ضروری ہے تب کہیں اُس میں دوسروں کو پہچاننے کی صلاحیت پیدا ہوتی ہے۔ اس کا فلسفہ حیات، انسانی اعلیٰ رویات کی پاسداری کرتا ہے۔ اس کے دل میں زندگی کے ایک ایک لمحہ کو صدیوں میں بدلنے کی خواہش کروٹیں لیتی رہی ہے۔ اس کے خیال میں صرف روشنی ہی مقصدِ حیات نہیں ہے بلکہ وہ سمجھتی ہے کہ تاریک ہو گزاریوں سے بھی روشن چراغ نمودار ہوتے ہیں۔ شفیقہ ایک ایسی علامت ہے جس میں سچائی، صداقت اور حسنِ مروت کے سارے سامان پیدا ہیں۔ ایک روشن حقیقت کی طرح زندگی کے تمام حُسن کو اپنی آنکھوں میں سمو کر لیتی ہے۔ یہ ساری باتیں اُس کی سرکیاتی زندگی کی آئینہ دار ہیں۔

شفیقہ ایک دن مجھ سے ملنے کے لئے دفترِ سیاست آئی۔ اُن دنوں وہ پروفیسر مغنی تبسم کی نگہبانی میں ”حمید آباد“ کے علمی و ادبی اداروں ”پریم فل“ کے لئے مقالہ لکھ رہی تھی۔ پروفیسر مغنی تبسم نے اُسے میرے ہاں بھجوایا تھا۔ شفیقہ مجھ سے ملنے سے پہلے عابد علی خاں صاحبِ میرِ سیاست کے پاس گئی تھی انہوں نے کہا کہ فیتر صاحبِ آفس میں ہیں، وہاں جا کر مل لیجئے۔ شفیقہ نے مجھ سے اپنا تعارف کر دیا لیکن وہ تو میرے قبیلے کی لڑکی تھی۔ بخارے مختلف پہلوؤں میں بٹ بھی گئے تو کیا، ایک دن اپنے قبیلے میں آکر مل جاتے ہیں۔ شفیقہ میری قرابت دار تھی۔ بسپدر میں میرے خاندان کے بہت سے لوگ رہتے ہیں۔ ویسے بھی ہمارے جدِ اعلیٰ بیعد کے ایک صوفی منش بزرگ حضرت سید قطب الدین حسینی بخاری کے ساتھ بید سے ہما باد آئے تھے۔

ایوانِ اُردو میں کسی نے مجھ سے کہا تھا کہ بیدار کی دو انتہائی ذہین لڑکیاں
 حیدرآباد یونیورسٹی میں ایم فل کر رہی ہیں۔ ان دونوں نے جو اہر لال نہرو یونیورسٹی
 دہلی سے امتیازی حیثیت سے ایم اے کیا تھا۔ شفیق نے دورانِ گفتگو اپنے بھائی
 پروفیسر کلیم اللہ قادری کا حوالہ دیا (جو کیمپس یونیورسٹی میں ایک مشہور سائنسٹ
 ہیں) اور دوسرے بھائی صبیحہ اللہ کے بارے میں بھی بتایا۔ شفیق کے تعلیمی معاملات
 میں اُمیں نے بہت زیادہ ساتھ دیا ہے۔ ایم فل کے بعد جب اُس نے پی ایچ ڈی
 کے لئے جامعہ عثمانیہ میں اپنا نام رجسٹر کروایا تو میں نے کتابوں کی فراہمی کے سلسلے
 میں بھی تعاون کیا۔ آل انڈیا ریڈیو سے ادبی پروگرامس دلوائے۔ اخبار سیاست
 میں مضامین چھپوائے۔ ویمنس کالج میں پارٹ ٹائم لکچر شپ کے لئے کوشاں رہا۔
 ایم فل کے مقالے کی اشاعت کے لئے میں نے ادبی ٹرسٹ اور تھامس اُردو ٹرسٹ سے
 گرانٹ دلوائی۔ حیدرآباد کے علمی و ادبی ادارے کے نام سے کتاب چھپوائی۔
 اس کتاب کے بعد ریڈیائی پروگرامس میں نشر شدہ مضامین پر مشتمل کتاب ”تعارف“
 شائع کی۔ اس کے علاوہ ایک بڑے بھائی کی طرح اُس کی سرپرستی کرتا رہا۔ المدینہ
 کالج آف ایجوکیشن محبوب نگر میں بحیثیت لکچر ملازمت دلوائی۔ جب شاداں کالج
 آف ایجوکیشن قائم ہوا تو عظمت آپا کے تعاون سے وہاں لکچر کی حیثیت سے اُس
 کا تقرر ہوا۔ جو تیر و ڈھکی کالج کی لکچر بنی۔ شفیق نے شاداں کالج میں عظمت غیاث
 کے نام سے ایک ادبی انجمن بنائی۔ وہ پابندِ مومن و مصلوٰۃ، دیندار اور مذہبی علوم سے
 گہرا رشتہ لڑکی ہے۔ — برجستہ تحریر اور ادبی و سیاسی موضوعات پر
 اظہارِ خیال کا لکھ اُسے حاصل ہے۔ مشرقی تہذیب کی پروردہ ہونے کے باوجود

روشن خیالی اس کا وصف ہے۔

شفیع نے تین دفعہ بیرون ملک کا دورہ کیا ہے۔ پہلی دفعہ ۱۹۸۳ء میں ۳ ماہ کے لئے کنفیڈراکئی تھی۔ دوسری مرتبہ ۱۹۸۵ء میں کیالس (امریکہ) چلی گئی۔ تیسری مرتبہ جنوری ۱۹۹۱ء میں شکاگو گئی۔ جب کبھی وہ بیرون ملک سے انڈیا آتی ہے تو کچھ ہی دن بعد اپنے حیدرآبادی رنگ میں ڈھل جاتی ہے۔

شفیع بہت سی اعلیٰ صلاحیتوں کی مالک ہے، اس کو ادب عالیہ کا بہت شوق ہے۔ اچھی کت میں جمع کرنا اور پڑھنا اس کا محبوب مشغلہ ہے۔ اس کے خاندان کا سلسلہ بیدر کے ایک صوفی منش عالم دین ولی صفت بزرگ حضرت امام المدرسین سے ملتا ہے۔ بیدر میں محلہ مدرس پاورہ ان ہی کے نام سے بسایا ہوا ہے۔

شفیع سے میرا رشتہ اس خاتما ہی نظام کا ایک ایسا حصہ ہے جس کو تشنگان عرفان محبت، قلندری کو اُجالوں کی سرزمین کا ورثہ سمجھتے ہیں۔ شفیع سے میرا رشتہ، خونی رشتوں، دودھ کے رشتوں اور انسانی رشتوں کی ایک ملی جلی کیفیات کی حیثیت رکھتا ہے۔ وہ میری عزیز ترین بہنوں میں مختلف خصوصیات کے سبب ایک اعلیٰ مقام رکھتی ہے۔ وہ شدت سے مجھے محسوس کرتی ہے۔ میں بھی خدمت کی اسی سطح پر پہنچ کر عبادت گاہوں کی پاکیزہ و معطر فضاؤں میں ضم ہو جاتا ہوں۔ شفیع کے نام "سفر جاری ہے" کا انتساب بھی ان ہی جذبات کا آئینہ دار ہے۔

شفیع جب پہلی بار امریکہ جاری تھی تو یوں محسوس ہو رہا تھا کہ

شائد وہ لوٹے گی نہیں، اُس موقع پر شفیع نے میرے چوتھے لڑکے
 نعیم الدین پرویز کو ایک قیمتی ایمپورٹڈ امریکن کیمرا اور میری آخری لڑکی
 زینت نسرت کو سونے کے جھکے اور بالیاں دے کر بے حد خوشی محسوس کر رہی
 تھی، گھر کے تمام لوگوں سے اپنی والہانہ وابستگی کا اظہار اپنے مختلف عمل
 کے ذریعہ کیا کرتی تھی، مگر میرے لئے سب سے قیمتی شفیع کے آنسو تھے جس
 نے میرا دامن بھگو دیا تھا، اُن میں سے کچھ آنسو اب بھی پلکوں پر جھلکاتے
 ہیں، خاص طور پر اُس وقت جب اُسکی آنکھیں اشکوں سے
 بے نیاز ہو جاتی ہیں۔



کویت کرن

کویت کرن سے میری پہلی ملاقات شعر و غم کے ماحول میں حمت ز گھوکار و ٹھل راؤ کے میوزیکل اسکول "سنگیت سادھنا" میں ہوئی۔ ایک شام جب میں سیاست آفس میں اپنے ادبی کام میں مصروف تھا تو میرے دوست و ٹھل راؤ مجھ سے ملنے کے لئے آئے اور مجھ سے خواہش کی کہ کچھ دیر کے لئے ان کے ہمراہ سنگیت سادھنا اسکول چلوں جہاں مجھے ان کے ایک دوست امبا جی راؤ ایڈیشنل سپرنٹنڈنٹ پولیس کی ہونہار لڑکی سے نہ صرف تعارف کرانا ہے بلکہ اُس کو اپنے سلف تانہ میں شامل کرنا ہے۔

جب میں وٹھل راؤ کے ساتھ "سنگیت سادھنا" پہنچا تو وہاں موجود لڑکیوں میں مجھے حیدر آبادی تہذیب سے آراستہ ایک لڑکی سب سے الگ دکھائی دی۔ مجھے دیکھ کر اُس نے اندازہ لگایا کہ میں کون ہوں۔ وٹھل راؤ کے تعارف کرانے سے پہلے ہی اس نے مجھے حیدر آبادی انداز میں سلام کیا۔ اس تعارف کے بعد میں کویت کرن سے کچھ غزلیں سنیں اور یہ محسوس کیا کہ اگر مناسب انداز میں اس نئی شاعرہ کی شعری تربیت کی جائے تو ایک دن یہ ہونہار شاعرہ اردو شعروادب میں اپنا مقام بنا سکے گی۔ کویتا کرن اُس وقت اردو رسم الخط سے کچھ زیادہ واقف نہیں

تھی اس لئے وہ (دیوناگری) ہندی رسم الخط میں اردو غزلیں لکھتی تھی۔ میں نے کویتا سے۔ پوچھا کہ تم اردو زبان سے اچھی طرح واقف ہو تو پھر اردو رسم الخط میں غزلیں کیوں نہیں لکھتیں۔ کویتا نے جواب دیا، مجھے اردو رسم الخط میں لکھنے میں تکلف محسوس ہوتا ہے۔ (اب کویتا اردو رسم الخط میں لکھی ہوئی کتابیں روانی کے ساتھ پڑھنے لگی ہے) کویتا نے مجھ سے یہ بھی کہا کہ ریڈیو اور ٹی وی کے ذریعہ غزلیں سننے کے علاوہ آڈیو اور ویڈیو کیسٹ سے غزلیں سن سن کر مجھے اردو شاعری سے دلچسپی ہونے لگی اور میں نے اپنے منتشر خیالات کو شاعری کے روپ میں ڈھالت شروع کیا۔

کویتا کرتن ابتداء میں اپنے چھوٹے بھائی شیام کے ذریعہ بغرض اصلاح میرے ہاں غزلیں سیاست آفس بھجواتی رہی۔ حسن اتفاق سے اُن دنوں شہر میں کئی اچھے مشاعرے ہوئے۔ میں نے کویتا کو ”محملِ خواتین“ کے بارے میں بتایا اور شریکِ معتمد محفلِ خواتین مظفر النساء ناز سے کہا کہ اس نئی شاعرہ کی محفلِ خواتین میں خاطر خواہ پذیرائی ہونی چاہیے۔ وہ محفلِ خواتین کے جلسوں میں شریک ہونے لگی۔ کچھ دنوں بعد جب کویتا نے کچھ اور غزلیں کہہ لیں تو مشورہ سخن کے لئے مجھے اپنے گھر واقع ملے پلے آنے کی خواہش کی۔

جب میں پہلی دفعہ کویتا کے گھر پہنچا تو وہ مقررہ وقت پر میرا انتظار کر رہی تھی۔ جیسے ہی میں نے اسکوٹر اسٹانڈ کی، وہ دروازہ کے قریب آکر ٹھہر گئی۔ دستک دی تو اس نے فوری کہا ”آئیے بھائی“۔ میں نے جب اس کا ڈرائنگ روم دیکھا تو مجھے بے حد خوشی ہوئی، اس کا ڈرائنگ روم صاف

ستھرا، ہر چیز اپنی جگہ سلیقہ سے رکھی ہوئی تھی۔ ڈرائنگ روم میں نہ تو ہندو کلچر کی چھاپ تھی، نہ مسلم تہذیب کا رنگ۔ کویتا کھل پوٹاک، اس کی گفتگو اس کے رہن بہن، اس کی نشست و برخاست، حیدر آبادیوں جیسی ہے۔

ملنے جلنے سے پتہ چلتا تھا کہ وہ خالص حیدر آبادی تہذیب کی دین ہے۔ دوران گفتگو جب کویتا مجھے بھائی کہہ کر مخاطب کرتی، تو مجھے بہت اچھا لگتا تھا۔ میں نے کویتا سے کہا تم پہلے میری بہن ہو، بعد میں میری شاگرد۔ ایسا کہنے پر وہ بہت خوش ہوئی۔ ایک دن وہ اپنے شوہر، بچوں اور اپنی بہن مینا کے ساتھ میرے گھر بازار روپعلی (سید علی چوہترہ) آئی۔ دوپہر سے شام تک رہی۔ ہم نے پنچ مل کر کھانا کھا، میری اہلیہ اور میری لڑکی زینت نسرتین نے ان بھانوں کی تواضع کی۔ جب میں اپنے نئے گھر ملے پٹی میں منتقل ہوا تو وہ اپنے بھائی کے ہمراہ میرے گھر آتی رہی۔ جب کبھی کوئی تازہ کلام ہوتا، میرے ہاں آتی یا اپنی والدہ کے مکان (واقع ملے پٹی) مجھے بلواتی۔ یہ سلسلہ اب بھی جاری ہے۔ گھر آنے سے پہلے فون فرود کرتی تاکہ میں گھر پر موجود رہوں۔

کویتا ایک خوش گو، خوش فکر شاعرہ ہے۔ اس میں یہ صلاحیت ہے کہ وہ فی البدیہہ شعر کہہ سکتی ہے۔ شہر کے حالیہ فساد پیدائش نے بہت ہی متاثر کن نظم بھی تھی جو سیاست میں شائع ہوئی۔ اس نظم کی اشاعت کے بعد اس کی مقبولیت کمزور اضافہ ہو گئی۔ کویتا ایک کم آئیز شاعرہ ہے۔ وہ مشاعروں میں بہت کم شرکت کرتی ہے۔ اس کی شاعری کے ابتدائی زمانے میں صفدریہ گزرنے والی اسکول میں اسکول کی سلور جوبلی تقاریب کا مشاعرہ ہوا تھا۔ یہ مشاعرہ کویتا

کی شاعرانہ زندگی کا یہ پہلا مشاعرہ تھا۔ اس مشاعرہ میں کویتا کو خوب داد و تحسین سے نوازا گیا۔ اس مشاعرہ کے بعد اُس کی شاعرانہ زندگی نے ارتقاء کی ایک نئی کروٹ لی۔ بعد ازاں اُس نے کئی مشاعرے پڑھے جن میں اس کو کافی سراہا گیا۔ کویتا کرن کی یہ خواہش تھی کہ اس کا مجموعہ کلام جلد از جلد شائع ہو جائے۔ اُس کی خواہش کے پیش نظر میں نے اُس کے کلام کا انتخاب شروع کیا۔ کویتا کے والد امبا جی راؤ صاحب نے اپنی بیٹی کی حوصلہ افزائی میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔ وہ کویتا کی ہر خوشی کا خیال رکھتے ہیں۔ امبا جی راؤ ایک خالص حیدر آبادی مزاج کے انسان ہیں۔ وہ نہ صرف اردو زبان سے ہی دلچسپی رکھتے ہیں بلکہ وہ اچھی طرح اردو لکھنا پڑھنا جانتے ہیں۔ وہ اپنی بیٹی کو شہر کے خاص خاص مشاعروں میں خود لے گئے ہیں، کویتا کو مشاعروں میں داد ملتی ہے تو خوش ہوتے ہیں۔ کویتا نے شکر جی میموریل گل ہند مشاعرہ کے علاوہ کئی بار ریڈیو سے اپنا کلام سنایا ہے۔ دور درشن کے پروگرام ’انجن‘ کے علاوہ نیشنل پروگرام (نٹ ورک) مشاعرہ میں بھی کلام سنا چکی ہیں۔ یہ سلسلہ اب بھی جاری ہے۔ تحت میں شعر سناتی ہیں، پڑھنے کا انداز متاثر کن ہوتا ہے۔

امبا جی راؤ ایک دن اپنی بیٹی کے ہمراہ میرے گھر آئے اور مجھ سے خواہش کی کہ کویتا کا مجموعہ کلام جلد از جلد شائع ہونا چاہیئے۔ کویتا نے اس دو سال کے عرصہ میں زائد ایک سو غزلیں کہہ لی تھیں۔ کچھ ہی دن بعد کویتا کا پہلا مجموعہ کلام جو صرف غزلوں پر مشتمل ہے ”پہچان“ کے نام سے شائع ہوا۔ کتاب کی اشاعت کے بعد ادبی حلقوں میں کافی ہل چل رہی۔ مولانا ابوالکلام آزاد ریڈیو

انسٹی ٹیوٹ میں عظیم الشان پیمانے پر رسم اجراء کی تقریب منعقد ہوئی۔ جناب
عابد علی خاں مدیر سیاست نے رسم اجراء انجام دی۔ جناب سید ہاشم علی اختر
سابق وائس چانسلر عثمانیہ وعلی گڑھ یونیورسٹی نے صدارت کی۔ جسٹس
گوپال راؤ اکبر ٹے، ڈاکٹر موہن لال نگم ڈاکٹر سالار جنگ میوزیم اور پروفیسر
معنی تبسم صدر شعبہ اردو جامعہ عثمانیہ نے یہاں خصوصی کی حیثیت سے شرکت کی۔
میں اس تقریب کا کنوینر تھا۔ محفل کے اختتام پر ہاشم علی اختر صاحب اور ڈاکٹر
راج پیلو گھٹ نے خاص طور پر کویتا اور اس کے اہل خاندان کو مبارکباد دی۔
مجھے خوشی ہوئی کہ کویتا کو اپنے خواب کی تعبیر مل گئی (اس کا مجموعہ چھپ گیا)۔
اس نے سوچا بھی نہ تھا کہ اردو محققوں میں اس کی شاعری کی اس قدر پذیرائی
ہوگی اور اردو شاعری کی بدولت ہی اس کی پہچان ہوگی۔
کویتا کہوں مجھے ہر راکھی پونم کے موقع پر راکھی باندھتی ہے اور بالواسطہ
اس بات کی خواہاں رہتی ہے کہ بھائی بہن کا یہ پاکیزہ رشتہ ہمیشہ اسی تازگی
کے ساتھ برقرار رہے۔



کتاب کا آخری صفحہ

ہمیں اپنے معاشرہ میں کچھ ایسے لوگ بھی مل جاتے ہیں جو زندگی کا حصہ نہ ہوتے ہوئے بھی زندگی کا اٹوٹ حصہ بن جاتے ہیں۔ طویل فاصلوں پر رہتے ہوئے بھی اپنی قربت کا احساس دلاتے ہیں۔ جن کی سانسوں کی گرمی اور جن کے فکر و خیال کی خوشبو پیراہن جسم و جاں کو ہمیشہ ہمکاتی رہتی ہے اور جن کی لمحاتی گفتگو بھی مدیوں کا سفر طے کرتی ہے۔ ایسے لوگ ہمارے آس پاس ہی رہتے ہیں جو اپنا دکھ درد آپس میں بانٹ لینے کی تمنا کرتے ہیں۔ وہ اپنی پہچان کے لئے احساس کے دروازے پر دستک دیتے رہتے ہیں۔ اگرچہ رشتے ایک دوسرے کی پہچان اور سماج کے نظام کے لئے بنائے گئے ہیں لیکن کسی بھی رشتے کے درمیان اگر محبت نہ ہو تو رشتوں کا کوئی مطلب ہی نہیں ہوتا۔ محبت رشتوں کو نہ صرف باقی رکھتی ہے بلکہ رشتوں کی تخلیق بھی کرتی ہے۔ ہر انسان کا دوسرے انسان سے رشتہ ہوتا ہے۔ یہہ اور بات ہے کہ ہم اپنی کم فہمی کی بنا پر اس رشتے کو پہچان نہیں پاتے۔ دراصل محبت مرکز ہے اور رشتہ دائرہ۔

یہہ منتشر لوگ بے تاج بادشاہوں کی طرح پاکیزہ جذبات کا احترام کرتے ہوئے رشتوں کے تقاضے کا تحفظ کرتے ہیں۔ ایسے لوگوں کی داستان ہر وقت ختم ہی نہیں ہوتی کہیں نہ کہیں ان کے لئے آس کے دروازے کھل جاتے ہیں۔ نقاب لہڑھی ہوئی شب کا آنکھ ڈھلک ہی جاتا ہے۔ سنائے آواز میں بدل جاتے ہیں۔ رشتوں کا ہجوم لڑھکتا ہے سوچتا ہے جو کدہ شہ کے اس ہجوم میں کس کو کس نام سے پکارا جائے کیونکہ جذبہ محبت تمام رشتوں سے اعلیٰ و ارفع ہے۔

